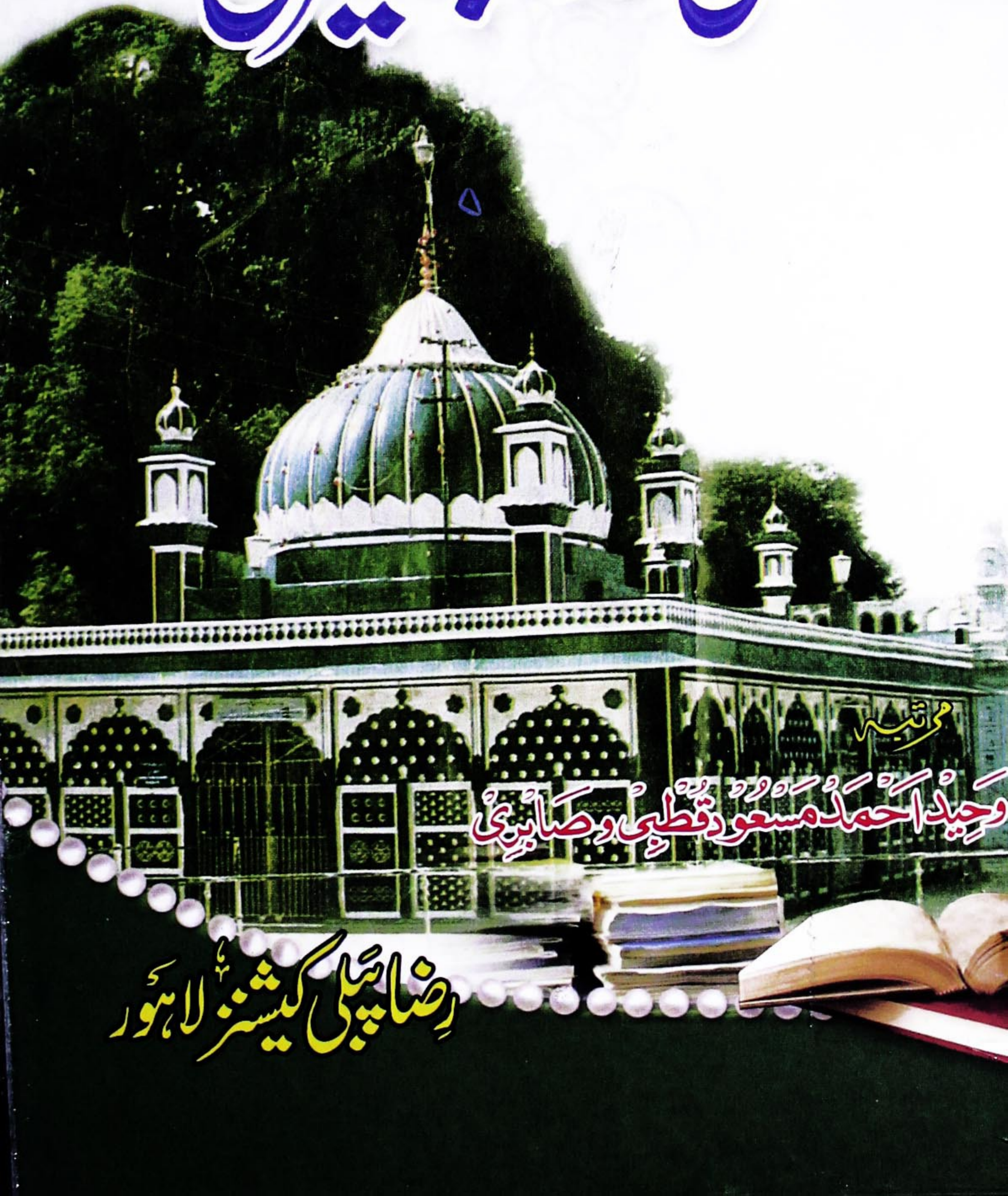


تشریح و مخدم علامہ الدین

علی احمد صابری

رحمۃ اللہ علیہ



مکتبہ
وحید احمد مسعود قطبی و صابری

رضا پبلی کیشنز لاہور

حق
سوانح

حضرت مخدوم علاء الدین

حق

علی احمد صابری
رحمۃ اللہ علیہ

حق

موتبہ

وحید احمد مسعود قطبی و صابری

رضا پبلی کیشنز لاہور

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدایا
ناقصاں را پیر کامل، کاملان را ارہمنما

85240

نام کتاب :- سوانح حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابری کلیری رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ :- وحید احمد مسعود قطبی، صابری

تحریک :- _____ حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری

تعارف :- _____ پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

پروف ریڈنگ _____ محمد عالم مختار حق

صفحات :- _____ ۱۹۲

سن اشاعت :- _____ 2003ء / 1424ھ

ناشر :- _____ میان زبیر احمد علوی گنج بخشی قادری ضیائی

تعداد :- _____ دو ہزار

نگران شعبہ نشر و اشاعت :- محمد ریاض ہمایوں سعیدی

مطبع :- _____ پرنٹ یارڈ - ملک پارک بلال گنج لاہور

ناشر: رضا پبلی کیشنز ۱۸۶۰ - انارکلی - لاہور ۲

فہرست مضامین

باب	صفحہ
تعارف	۵
سات سو چھیاسی	۳۷
ابتدائی حالات	۴۱
خلافت	۵۸
ولایت	۶۹
تذکرہ جات صابری	۸۹
صابری تعلیم	۱۲۵
سلسلہ صابری	۱۳۳
شجرہ صابری	۱۷۵
درگاہ و عرس	۱۷۹
صابری سجادہ نشین	۱۸۷
صابری خاتقاہیں	۱۹۰
کتابیات	۱۹۲

انتساب

پیکر صبر و استقلال واجب الاحترام حکیم اہل سنت حکیم
محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے نام جن کی صحبت کے فیض
صحبت سے اس ناچیز نے نہ صرف کتاب کے ساتھ محبت
کا سلیقہ سیکھا بلکہ کتاب کے سینے میں محفوظ علم کی نشرو
اشاعت کا قرینہ بھی پایا۔ آپ کی نظر کیمیا اثر کا فیضان
ہے کہ یہ علمی ارمغان قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا
ہے۔ یہ عنوان انتساب میرے لیے باعث فخر و ناز ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

نائر: میاں زبیر احمد علوی منج بختی قادری ضیائی

حضرت لاہور

تعارف

جناب فقیر اکبر محمد اویق قادری مرحوم ایسے بزرگ ہیں

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں شیخ سلیم چشتی (فتح پور سیکری) عہد اکبری کے وہ بزرگ ہیں جن کے آستانہ پر اکبری جاہ و جلال بھی سجدہ ریز رہتا تھا۔ اکبر اعظم کا ولی عہد شہزادہ سلیم، ان کی دعاؤں کا ثمرہ تھا اور اس کی اتدائی پرورش بھی ان ہی روحانی شیخ کے گھر میں ان کے زیر عاطفت ہوئی۔ شیخ سلیم چشتی کے داماد شیخ اعظم فریدی فاروقی بدایونی تھے جو اربلا اور منونہ (متصل اولہ) کے ٹھاکروں سے کسی مقابلہ میں ۹۹۱ھ میں شہید ہوئے۔

مغلیہ دور میں اس خاندان کے کئی ارکان اعلیٰ عہدوں اور مناصب پر فائز رہے اور ان سے وفاداریاں اور جاں نثاریاں ظہور میں آئیں۔ قطب الدین کو کلتاش، نواب فرید، شیخ ایراہیم کشور خاں اور شیخ الہ دیا اخلاص خاں اسی زمرے میں آتے ہیں۔

انگریزی دور میں بھی اس خاندان کا اعزاز و احترام باقی رہا۔ شیخ شرف الدین اس خاندان کے وہ بزرگ تھے جنہوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بدایوں کے کلکٹر ایڈورڈ کی مدد کی اور اس کو چھپانے رکھا جس کھلمہ میں اعزاز و اکرام اور انعام و خطاب سے نوازا۔ سر سید احمد خاں نے شیخ صاحب کے حالات و خدمات کا مفصل "ذکر لائل محمدنس آف انڈیا" میں کیا ہے۔ شیخ شرف الدین کے ایک صاحبزادے شیخ امیر احمد تھے جن کے صاحبزادے ① خان بہادر شیخ سید محمد ② شیخ وحید احمد اور ③ خان صاحب شیخ محب احمد تھے۔

شیخ وحید احمد کا اصل نام وحید محمد تھا لیکن وحید احمد عرف وحید میاں کے نام سے مشہور ہوئے آخر میں اپنے نام کے ساتھ مسعود کا اضافہ کر لیا تھا۔ وہ ۱۸ مارچ ۱۸۹۳ء کو شیخوپورہ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ حسب رواج ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ عربی و فارسی سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ مولوی حامد علی اور مولوی احمد الدین صاحب (مدرس مدرسہ شمس العلوم بدایوں) کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ وحید میاں کی طبیعت کا رجحان درس نظامی کی طرف تھا اور وہ عربی زبان و علوم کی باقاعدہ تحصیل کرنی چاہتے تھے مگر ان کے بھائی سید محمد عرف میکومیاں نے انگریزی تعلیم کی طرف زور دیا اور وحید میاں ۱۹۰۲ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں داخل ہو گئے پھر وہ علی گڑھ چلے گئے اور وہاں آٹھویں درجہ میں داخلہ لیا لیکن اتفاق سے کسی ساتھی کے چھپک نکل آنے کی وجہ سے عارضی قواعد و قیود سے پریشان ہو کر گھر آ گئے اور پھر مراد آباد کے اسکول میں داخل ہوئے مگر علالت کی وجہ سے شریک امتحان نہ ہو سکے بالآخر علی گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد میجر بجن بلگرامی (ف ۱۹۰۲ء) کے کیمبرج اسکول (علی گڑھ) میں داخل ہوئے جو جعفر منزل میں کھولا گیا تھا۔ وحید میاں کی دلچسپی ٹیکنیکل مضامین میں بدرجہ غایت تھی لہذا ان کے اساتذہ نے مشورہ دیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جاتیں چنانچہ ۱۹۱۲ء میں وہ لندن پہنچ گئے لیکن کیمبرج اسکول (علی گڑھ) کے زمانہ کا ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے جس سے ان کے مزاج اور آئندہ کے عزم کا اظہار ہوتا ہے ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے ایک حصہ کے انہدام کا مشہور حادثہ فاجعہ ظہور پذیر ہوا بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا اس وقت صوبہ یو۔ پی کا گورنر مسٹن تھا وحید میاں نے ایک مضمون بعنوان "مستان کے نام کھلا خط" لکھا مسٹن کو "مستان" لکھ کر خوب کر دار نگاری کی۔

وحید میاں کے لندن پہنچتے ہی جنگ عظیم اول (۱۹۱۸ء - ۱۹۱۴ء) کا آغاز ہو گیا لہذا ان کے گھر سے واپسی کے تقاضے شروع ہو گئے۔ انہوں نے لندن کی بجائے مانچسٹر کے ایک ٹیکنیکل اسکول میں ایکٹریکل ڈپلومہ کے حصول کے لئے داخلہ لے لیا مگر وہاں کچھ ایسے حالات اور پیچیدگیاں رونما ہوئیں

کہ انہوں نے مانچسٹر کے اسکول کو چھوڑ کر گلاسگو کی راہ لی اور ایک ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ میں داخل ہو گئے ۱۹۱۶ء میں چھٹیاں گزارنے کے لیے وہ گھر (سینچورپور) آئے۔ لیکن گھر والوں نے جنگ عظیم کی ہولناک فضا کی وجہ سے انہیں پھر واپس نہیں جانے دیا اور وہ اپنے نصاب کی تکمیل نہ کر سکے۔ انگلینڈ میں ان کا قیام تقریباً دو سال رہا۔

انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے ایگسٹریکل لائن میں بمبئی اور کانپور میں مزید تجربات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ۱۹۱۸ء میں ان کے بھائیوں میں جاوید کی تقسیم ہو گئی اور وہ کلی طور سے اپنے معاملات کے ذمہ دار ہو گئے۔

وحید میاں کی مثلث حیات کے مندرجہ ذیل تین زاویے رہے

① سیاست ② ادب ③ تصوف

انہوں نے ایک قدیم زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ریاست و امارت میں پلے بڑھے ان کا خاندان انگریزی حکومت کا خاص وفادار اور مدد و معاون رہا۔ خان بہادر کے خطابات اور آئریہ مجسٹریٹی وغیرہ سینچورپور کے فریدی شیونج کے لیے وقف تھی۔

نور و وحید میاں کے بڑے بھائی میکو میاں خان بہادر اور چھوٹے بھائی محمد صاحب کے خطابات اور آئریہ مجسٹریٹی وغیرہ سے منتخز تھے۔ وحید میاں کی آزاد طبیعت نے تحریک آزادی کے اکابر سے رشتہ جوڑا اور مولانا محمد علی و شوکت علی سے وابستگی رکھی۔ ۱۹۳۳ء میں وحید میاں یو پی کونسل کے ممبر رہے اور ۱۹۳۷ء میں بھی کانگریس کے ٹکٹ پر ایم۔ ایل۔ سی منتخب ہوئے اور کونسل کے دھپ کی حیثیت سے کام کیا۔

وحید میاں کبھی موج میں ہوتے تھے تو ان انتخابات کی کوششوں، ہنگاموں اور معرکہ آرائیوں کی دلچسپی اتان نہ لیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں پہلی بھیت میں خاص معرکہ رہا اور نوک جھوک کے واقعات ظہور پذیر ہوئے مگر کامیابی وحید کو ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں بھی وہ کانگریس کی طرف سے میجر جلیسٹو کونسل منتخب ہوئے۔ جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا تو بیلوں کی تقریبات میں وہ ہمان

خصوصی تھے انہوں نے پولیس گراؤنڈ میں پولیس کی سلامی لینے کے بعد وزیر اعلیٰ کا پیغام سنایا۔ وہ یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ کو بند بلبھ پنٹ کی وزارت میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے۔

وجید میاں اپنی فائلیں خود دیکھتے تھے ان پر نوٹنگ کرتے تھے، بڑی حد تک فیصلے بھی کرتے تھے اور روز کا کام روز نمٹالیا کرتے تھے دوسرے لوگ اس پر تعجب کرتے تھے۔ وجید میاں کے ایک دوسرے پارلیمنٹری سیکرٹری مولوی محفوظ الرحمن نامی (بہرائچ) کے حسن اخلاق اور کارکردگی کے بھی معترف تھے۔ نامی صاحب کے علم و فضل، دیانت داری اور تفقہ فی الدین کا ان کے دل پر گہرا اثر تھا۔ مولانا نامی نے ایک کامیاب عربی درس گاہ (بہرائچ) کے قیام کے ساتھ ساتھ قرآن اور عربی کی تعلیم و تدریس کے لیے ایک مکمل نصاب کئی جلدوں میں تالیف کیا تھا جس کا ایک ایڈیشن کراچی میں بھی شائع ہوا تھا۔

نامی صاحب کے ایک شاگرد مولانا خالد قاہری الہ آبادی ہماری دوست ہیں۔ وجید میاں رفیع احمد قدوائی کی پادٹی کے آدمی تھے بدایوں اور اس کے نواح میں ۱۹۴۶ء سے فسادات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس میں روز

بروز تیزی اور وسعت ہوتی رہی۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مسلمان ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ شیخ محمد سلیمان مرحوم (دف ۱۹۶۳ء) نے فسادات بدایوں کی مکمل روداد بدایوں ۱۹۴۶ء میں لکھی ہے جس سے اس دور کی غارت گری اور ہولناکی کا اندازہ ہوتا ہے وجید میاں اس زمانہ میں سپک کی کوئی مدد نہ کر سکے غالباً وہ بھی مجبور تھے البتہ شیخ محمد سلیمان کے لیے وہ ضرور ڈھال ثابت ہوئے۔ بدایوں کے کلکٹر جے۔ ڈی شکلا نے شیخ صاحب کو بند کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر وجید میاں نے آڑے آکر کلکٹر کی غلط فہمیاں دور کیں اور محمد سلیمان کو بچا لیا۔ اس صورت حال سے وہ دل گرفتہ بھی تھے۔ شاید اسی لیے ۱۹۵۳ء کے انتخاب میں انہوں نے حصہ نہیں لیا۔

وجید میاں جس زمانہ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے اس زمانہ میں انہوں نے علمی و ادبی اور وقتی مسائل پر خوب لکھا اور ریڈیو سے تقریر بھی کیں۔ ان کی تین کتابیں ① تصوف کی اصیلت ② گہرا راہ اور

(۳) اسلام مشرق میں اسی دور کی یادگار ہیں۔

وحید میاں نے ادبی میدان میں نمایاں کام کیا وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ تاریخ و تحقیق کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ انہوں نے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے خالص علمی و ادبی ماہوار رسالہ ”نقیب“ فروری ۱۹۱۹ء سے جاری کیا۔ اس کے صرف ۳۶ شمارے شائع ہوئے اور جنوری ۱۹۲۲ء کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اس کی عمر اگرچہ کم ہوئی مگر ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی اور آج بھی ادبی و تحقیقی تحریروں میں کہیں نہ کہیں ”نقیب“ مرحوم کا ذکر آجاتا ہے۔ اس رسالہ پر میر خفونظ علی، محمد عظمت اللہ خاں اور سلطان حیدر جوش جیسے صاحب طرز ادیبوں کے ادب و انشا کی چھاپ تھی اور اسے حسن قبول حاصل تھا۔ علامہ سلیمان ندوی مرحوم اس طرح رقم طراز ہیں

”نقیب“ کو ہر مہینے دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ نصیحت کا تلخ گھونٹ باسانی انسان کے حلق کے نیچے نہیں اترتا۔ جب شوخی و ظرافت کی شکر میں اس کو ملفوف نہ کر لیجئے مگر اس میں بعض لوگ اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ متانت اور سنجیدگی کا ذائقہ اس میں باقی نہیں رہتا لیکن نقیب نے جس اسلوب ادب کا متبع کیا ہے وہ اعلیٰ سنجیدہ شوخی اور بہترین مہذب و متین ظرافت کی مثال ہے۔ اس کی ہنسی زیر لب مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھتی اور بے باک لالابالیوں کے قہقہہ کی آواز نہیں بن جاتی۔ اہل دل اس کو سمجھ کر متبسم ہو جاتے ہیں اور ناشائس اس کو نہ سمجھ کر مکر نہیں ہونے پاتے۔ ہماری زبان میں یہ صنف کلام ابھی ناپید ہے نظم میں لیجئے تو سودا و فغان اور مصحفی و جرات کے ہزلیات ہیں اور نثر جدید میں بیخ کی جلدیں مگر یہ زمین اصلاح و درست طلب ہے۔ سعدی سے بڑھ کر ہمارے بوڑھے ادیبوں میں کون ہوگا لیکن پند نامہ سعدی کے ساتھ ساتھ مطائبات

۱۔ مکتوب علامہ سلیمان ندوی بنام وحید احمد مدیر نقیب بدایوں (اپریل ۱۹۲۲ء)

سعدی کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ اردو میں جدید طرز پر لکھنؤ اور پٹنہ کے بعض انشا پردازوں نے داغ بیل ڈالی مگر وقت کی محفل نے ان کو داد دیدے کر تہذیب و متانت کی حد سے آگے بڑھا دیا۔ گو میں اپنے انداز عبارت میں ہیرم خشک ہوں کہ میرے اسلوب بیان کے لب پر کبھی مسکراہٹ ہی طاری نہیں ہوتی لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی اہم سے اہم اور سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع نہیں جس پر نقیب کے طرز انشا کا قلم آسانی اور کامیابی کے ساتھ رواں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بدایوں کے مصنفؒ تجاہل عامیانه کو دارالمصنفین کی طرح ایک دارالمتجاہلین قائم کرنا چاہیے ورنہ ڈر ہے کہ ان کے بعد یہ طرز ناپید نہ ہو جائے۔“

مصور فطرت خواجہ حسن نظامی یوں اظہار خیال فرماتے ہیںؒ

”نقیب الیے وقت بولا جبکہ ہماری شاہانہ سواری کا جلوس خاک بسر ہو چکا تھا قافلہ کے نشان، خاک پر، اور اوراق تاریخ بنے ہوئے پامال نظر آتے تھے منزل ہمارے کارواں کی پرچشم، پر آب تھی۔ نقیب رسالہ میں سات سو چھیاسی کا مضمون پہلی بسم اللہ صحیح ہے بہت خوب انداز ہے اور بہت ہی خوب عنوان ہے۔ اظہار مقصد کا فیشن اس سے زیادہ صاف سلیس اور پُر لطف عبارت میں ممکن نہ تھا۔“

نقیب کو ہندوستان کے مشہور اور نامور ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل تھا ذرا فہرست ملاحظہ فرمائیے۔ علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، فصاحت جنگ جلیل مانک پوری، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، مہاراجا سرکرشن پرشاد شاد، خواجہ حسن نظامی، مولانا آزاد سجانی، پروفیسر نواب علی، قاضی عبدالغفار، آصف علی دہلوی، سید ہاشمی فرید آبادی، نیاز فتح پوری، عظمت اللہ خاں، چودھری محمد علی ردو لوی، محفوظ الحق عظیم آبادی، کیفی چریاکوٹی، عزیز لکھنوی، شاہ علی احسن مارہروی، سید ابو محمد ثاقب کانپوری، حامد اللہ انسر میرٹھی، ثاقب لکھنوی، خاں بہادر

۱۔ پیر محفوظ علی بدایونی ۲۔ نقیب مارچ ۱۹۱۹ء۔

مرزا سلطان احمد، محوی لکھنوی، محشر لکھنوی، احسن سمبھی، چودھری رحم علی ہاشمی وغیرہ وغیرہ۔

بدایوں کے اصحاب شعر ادب بھی "نقیب" سے پورا پورا تعاون کرتے تھے اور ان کی

تخلیقات بالالترام شائع ہوتی تھیں مندرجہ ذیل نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

میر محفوظ علی، فانی بدایونی، سلطان حیدر جوش، مولوی ابوالحسن، مولانا یعقوب بخش راغب

سید عنایت احمد، قمر الدین احمد، محمد بن نازش، ابرار حسین قادری، بسطین احمد، امیر احمد امیر (ٹونک والے)

قاضی غلام امیر، ثاقب بدایونی، سید ابن علی، دامتق بدایونی، چودھری محمد ابراہیم خلیل، چودھری محمد اسماعیل

سید محمد میکومیاں — وغیرہ۔

نقیب کے خیمت درم اور کامیابی کے بارے میں فاضل مدیر لکھتے ہیں

"یہ سچ میرزا کا خیر مقدم جس محبت اور ہمت افزا تعریف کے ساتھ کیا گیا ہے اس

کے شکریہ کے لیے خاکسار کو الفاظ تلاش کرنا گوگرداہم کی تلاش سے کم نہیں، سچ یہ ہے کہ اس

تعریف کے مستحق دراصل نقیب کے فاضل مضمون نگار صاحبان ہیں جن کی بدولت محبت

کے بار اور ہمت افزائی کے طے نصیب ہوئے"

اپنی کامیابی اور نقیب کی مقبولیت پر وحید میاں اس طرح رقمطراز ہیں۔

"میرا شنہا ہی تجربہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اگر کسی کام کو ہمت و استقلال

سے شروع کیا جائے تو کوئی مشکل نہیں جو سنگ راہ ہو اور کوئی مدد نہیں جو غیر متوقع

اور غیر مترقب طریقہ سے نہ ملے اس کا ثبوت نقیب کے ہر صفحہ سے مل سکتا ہے"

شروع میں نقیب نظامی پریس بدایوں میں چھپتا تھا مگر ستمبر ۱۹۱۹ء سے نقیب پریس قائم

ہو گیا تھا۔ اس پریس سے فانی کاسب سے پہلا دیوان شائع ہوا جس پر وحید میاں نے مقدمہ لکھا تھا۔ نقیب

۱۹۱۹ء مارچ ۱۹۱۹ء، نقیب اگست ۱۹۱۹ء

پریس کا ایک چھوٹا سا ایک ڈپو بھی تھا۔

نقیب پریس بدایوں سے اکبر الہ آبادی کا کلیات بھی شائع ہوا تھا۔ رسالہ "نقیب" کی بدولت اکبر الہ آبادی سے وحید میاں کے تعلقات قائم ہو گئے اور وہ ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوئے چنانچہ لکھتے ہیں:

”نقیب جب سے وجود میں آیا ہے میں نے کوشش کی ہے کہ احباب کے لیے

سفر سے تحفے لاکر پیش کیا کروں چنانچہ اس وقت بھی ایک تحفہ ہفت روزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ میں الہ آباد

گیا تھا اور یہ سوچ کر گیا تھا کہ سنگم ضرور دیکھوں گا، امرود ضرور کھاؤں گا اور خان بہادر سید

اکبر حسین صاحب قبلہ کی قدم بوسی حاصل کر کے منائے دیرینہ ضرور پوری کروں گا دریلے

گنگ و جمن کا سنگم نہ دیکھ سکا مگر جناب پنڈت موتی لال نہرو کے ”اندر بھون“ میں مہاتما گاندھی

اور مولانا شوکت علی کے سنگم کے درشن کئے اس روز مہاتما گاندھی ”تک میوریل اسکول“

کانگ بنیاد رکھنے والے تھے۔ امرود ضرور کھائے مگر اب تک حیرت ہے کہ شہرت کا باعث

بد مزگی ہے یا گرانی، ممکن ہے کہ میرے عزیز دوست فخر الدین احمد صاحب بی اے

نے جن کے یہاں میں مہمان تھا عمدہ امرود کھلا کہ بدایوں کے پیڑوں کی وقعت میرے

دل سے کم کرتی نہ چاہی ہو۔ بید صاحب قبلہ کی زیارت حاصل ہوئی وقت بے وقت

بھی تھا اور کم بھی تاہم میری آرزو پوری ہو گئی۔ کم یوں کہوں گا کہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ

کیسے ختم ہو گیا۔

وحید میاں نے اپنی اس ملاقات کا ایک دلچسپ واقعہ ایک مضمون میں اس طرح نقل کیا ہے۔

”اللہ مغفرت کرے، حضرت سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی کی شخصیت بھی کتنی

عجیب و عظیم تھی، کل کی سی بات ہے کہ میں ایک شام کو بعد مغرب اپنے کرم فرما مولوی

سہ نقیب زمبستہ ۱۹۲۰ء وحید میاں کے ایک مضمون مرتبہ مارچ ۱۹۳۳ء سے مقبلس۔

قمر الدین صاحب بی۔ اے۔ ایل ٹی کی معیت میں ان کے سلام کو حاضر ہوا۔ نہایت
 تپاک سے پیش آئے، شمع منگوانی اور اپنی بیاض میں سے مسکرا مسکرا کر اپنا کلام سنایا۔
 میں نے پنسل سے اشعار نوٹ کرنا چاہے تو قمر صاحب کی طرف اشارہ کرتے
 ہوئے فرمایا: تمہارے پاس تو ہمارا یہ پورا دیوان موجود ہے؛ جب شعر
 پڑھا۔

تہذیب مغربی میں ہے بوسہ تلک معاف
 آگے جو اس سے بڑھتے، شرارت کی بات
 بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ یہ آپ نے کیسے لکھا، فوراً دریافت کیا کیا بات،
 اب مجھے اپنی حماقت آمیز جسارت کا احساس ہوا۔ اور ہکا بکارہ کیا نہایت
 اصرار سے کہنے لگے: کہتے کہتے کیا بات ہے؛ طالب علمانہ گستاخی کی تو
 عادت تھی ہی، مجبور ہو کر کہہ بھی ڈالا اور اب حماقت و افسوس ہے کہ کیوں
 کہہ ڈالا کہ پکڑ لی سرکس کی لڑکیاں زیادہ دست درازی پر کہا کرتی ہیں۔

سن کر بہت ہنسے اور فرمایا شاعر پر چودہ طبق روشن ہوتے ہیں وہ اپنے ہی واقعات
 نہیں لکھتا بلکہ دوسروں کے بھی واردات لکھا کرتا ہے۔

اکبر الہ آبادی مرحوم نے مدیر نقیب کے نام مندرجہ ذیل خط میں نقیب کو ایک شعر میں یوں موضوع

کیا ہے۔

”عزیز من سلم“

نقیب اپریل ۱۹۱۹ء۔

کیا عرض کروں۔ دل و دماغ پر قابو نہیں، جن صاحبوں سے مراسم دیدہ ہیں
ہیں ان کی خدمت سے ہی قاصر ہوں۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے۔

خطرہ ہوا جو قوم کو فوج رقیب کا

۱۹۱۹ء تکلام مقابلہ کورسالہ نقیب کا
اکبر

نقیب میں اکبر الہ آبادی کا کلام مسلسل شائع ہوا اور مولوی قمر الدین احمد بدایونی نے
ایک طویل مضمون بعنوان "کلام اکبر پر ایک نظر" لکھا جو نقیب میں برابر شائع ہوتا رہا۔ اور ممکن ہے کہ ان
کا یہی مضمون ان کی کتاب "بزم اکبر" کی تالیف کا محرک ہوا ہو۔

علامہ اقبال سے وحید میاں کے تعارف کا ذریعہ بھی نقیب ہوا۔ طرفین سے خط و کتابت
رہی اور کبھی کبھی علامہ اقبال کا کلام "نقیب" میں اشاعت پذیر ہوتا۔ علامہ کے تین خط وحید میاں کے
نام محفوظ رہ سکے جو اقبال نامہ حصہ اول (صفحہ ۲۲۵ تا صفحہ نمبر ۲۲۸) میں شامل ہیں۔ نقیب ستمبر ۱۹۱۹ء میں
علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل تین شعر بخط اقبال شائع ہوئے۔ ۱۷

از من اے باد صبا گوتے بہ دانگے فرنگ	عقل تاباں کشود است گرفتار تر است
برق را این بہ جگر می زنداں رام کست	عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگ گل ولالہ نہ بیندورنہ	آنچہ در پردہ رنگ است پدیدار تر است

وحید میاں نے علامہ اقبال کے کسی شعر کو موضوع بنا کر مضمون لکھنا چاہا تو انہوں نے

مندرجہ ذیل رباعی لکھ کر یہ بھی کہ اس پر مضمون لکھئے۔ ۱۸

۱۷ انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار (اقبال اکیڈمی کراچی ۱۹۶۷ء) ص ۱۷۵

۱۸ ایضاً صفحہ ۱۷۵ ملاحظہ ہو پیام مشرق ص ۲۲۵ - ۲۲۶۔

۱۹ ایضاً ص ۱۷۶۔

تو اے کو دک منش خود را ادب کن
 مسلمان زاده، ترک تسب کن
 یرنگ احمرو خون ورگ و پوست
 عرب نازداگر، ترک عرب کن
 مزید تشریح کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں لے

”اس زلمنے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز و
 نملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل
 اس کا احساس کیا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے
 میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔“

علامہ اقبال پر وحید میاں کے دو مضمون (۱) انسان اقبال کی نظر میں اور (۲) اقبال اور نظریہ سعی و عمل
 ان کے مجموعہ مضامین ”گردِ راہ“ میں شامل ہیں۔

خواجہ حسن نظامی سے بڑی بے تکلفی تھی۔ بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہونے
 کی وجہ سے خواجہ صاحب انہیں ماموں کہا کرتے تھے اور ان کے مضامین منادی میں شائع ہوتے
 تھے۔ خواجہ حسن نظامی سے خاکسار کا تعارف وحید میاں ہی کے ذریعہ ہوا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر کے تو وہ سپاہیوں میں تھے اور ان سے نہایت عقیدت رکھتے تھے۔
 قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں۔

سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ علی برادران کے ہاتھ میں جھنڈا تھا اور پرچوش اور
 سرفروش نوجوانوں کا ایک جتھا ان کے گرد و پیش تھا اس جتھے میں وحید احمد
 صاحب تھے۔ علاوہ محمد علی کے میسرے اور ان کے درمیان ایک بڑا رابطہ
 ان کا ادبی ذوق تھا اور میرے اور ان دونوں کے ادبی ذوق کے پیرمغاں

لے انوار اقبال ایضاً صفحہ ۱۷۶

مرحوم و مغفور سید محفوظ علی تھے۔۔۔۔۔ سید محفوظ علی کی صحبت میں اس زمانہ کے نوجوان اور ناک نقشہ سے درست وحید احمد صاحب کے ملاقات ہوتی پھر جب انہوں نے مرحوم (سید محفوظ علی) کے اشارے سے رسالہ نقیب نکالا تو اس کے صفحات پر کچھ مضامین میں نے بھی لکھے۔ (دیباچہ گہ دراہ)

پانچ سال کی اسارت کے بعد جب ۱۹۱۹ء میں علی برادران کی رہائی ہوئی تو وحید میاں نے نقیب کا ایک خاص نمبر (جنوری ۱۹۲۰ء) نکالا جو نہایت اہم ہے اس میں وحید میاں کے علاوہ قاضی عبدالغفار میہر محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ اسی خاص نمبر کے لیے علامہ اقبال نے شہباز و شاہین کے عنوان سے مندرجہ ذیل شعر لکھے تھے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرہ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک از فرچیز کیا ہے اک لہو کی بوند
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر جو ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپرزائغ و زغن از بند قید صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

مولانا محمد علی جوہر نے عازم یورپ ہوتے ہوئے ”بحالت سفر ریل“ مندرجہ ذیل خط لکھا ہے اور غالباً پیغام خاص سے نوازا ہے لہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نبی کے گھر کا غلام ہو کر قدم بڑھانے میں تامل
یہ راہ وہ راہ حق ہے غافل حسین نے جسمیں دریا

محمد علی جوہر عازم یورپ
بحالت سفر ریل ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ء

لہ نقیب جنوری ۱۹۲۰ء

نقیب کے اس خاص نمبر کے سلسلہ میں وحید میاں لکھتے ہیں یہ

”شوکت علی محمد علی کی رہائی کی تقریب مسرت میں نقیب نے یہ اہتمام کیا کہ اس کے آخری نمبر کے تمام صفحات انہیں دو بھائیوں کے لیے وقف ہوں۔ اس بات کا اعتراف ہے کہ جس قدر دل چسپ اس نمبر کو بنانا چاہیے تھا اس قدر دل چسپ نہیں سکا۔ عذر کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ گزارش شاید کسی قدر قابل پذیرائی ہو کہ خاکسار ایڈیٹر ۲۸ جنوری تک تقریباً ان حضرات کے ہمراہ رہا۔ باوجودیکہ اس نمبر کو شوکت علی محمد علی کے لیے وقف کرنا پیش نظر تھا پھر بھی اس عرصہ میں نقیب کے لیے کچھ سامان نہ کر سکا۔ ۲۸ جنوری کے بعد سے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا۔“

وحید میاں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء تا ۲۸ جنوری ۱۹۲۰ء کا روزنامہ علی برادران مرتب کر کے شائع کیا ہے جو خاصہ کی چیز ہے۔

غرض نقیب کے ذریعہ وحید میاں نے خاصا کام کیا اور نام پایا۔ ان کے ہم عصر رسائل و جرائد نے صرف ”نقیب“ کو سراہا بلکہ وقتاً فوقتاً اس پر گراں قدر راتے کا اظہار کیا ہے چنانچہ صبح امید لکھنو، جنوری ۱۹۲۱ء کے شمارہ میں ”نقیب“ بدایوں پر تبصرہ کرنے ہوتے رقمطراز ہے بلکہ

”نقیب“ (اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۲۰ء) نقیب کے

اکتوبر نومبر ایک ساتھ اور دسمبر نمبر علیحدہ تینوں ایک ہی

ماہ کے اندر شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں پرچوں میں کئی مضامین قابل قدر

ہیں ”یروغن قاز“ از محمد عظیم اللہ خاں صاحب اور ”عالم ارواح“ از سلطان حیدر جوش

۱۔ نقیب جنوری ۱۹۲۰ء ۲۔ جنرل خدائش لائبریری پٹنہ نمبر ۱-۱۱ (۱۹۱۹ء)

دونوں مضامین دل چسپ ہیں اور اپنے رنگ میں اچھے ہیں... ”ہندوؤں کے مختلف مذاہب“ عزیز آسیونی نے ایک مفصل اور دل چسپ مضمون لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مضمون نے ہنود کے مذاہب و فلسفہ سے واقف ہونے کی کوشش کی ہے جو اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ اہل اسلام بالعموم اس طرف سے لاپرواہ ہوتے ہیں، قابل تحسین ہے۔ محمد حسین صاحب نازش بدایونی نے حکیم مرزا آغا حسن ازل لکھنوی کا کلام اور بالخصوص ان کی مثنوی سحر عشق پر تبصرہ کیا ہے جو خوب ہے... انہی نمبروں میں حضرت اکبر الہ آبادی کا کچھ تازہ کلام بھی شائع ہوا ہے۔ ملک کی موجودہ صورت حال کو حضرت اکبر نے اپنے مخصوص رنگ میں چند اشعار میں خوب بیان کیا ہے نقیب کے دبیر نمبر میں صرف ایک مضمون اچھا ہے حامد اللہ صاحب افسر نے ”مہد مغلیہ میں ہندوستان میں ترویج تعلیم“ کے عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا ہے اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ صاحب مضمون صرف ایف اے کلاس کا طالب علم ہیں، مضمون قابل داد ہے،

وجید میاں، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی اولاد امجاد سے تھے، شیخ سلیم حشتی رحمۃ اللہ علیہ ان کے بزرگوں میں تھے وہ تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے خاصا ریاض کیا مختلف مشائخ، صوفیہ اور فقرا سے ملے ان سے گفتگو اور صحبتیں رہیں بعض مجاہدے اور ریاضتیں بھی کیں۔ بدایوں میں شاہ ولایت صاحب کی درگاہ شہر سے دور جنگل میں ہے۔ رات میں ہاں کسی کا گزر نہیں ہوتا۔ وجید میاں راتوں میں شاہ ولایت صاحب کی درگاہ میں بھی رہے۔ مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی (د ۱۹۴۸ء) اس ذوق و جستجو میں ان کے شریک سفر رہے۔ بعض اوقات وجید میاں نے ان واقعات کی تفصیل بھی بیان کی جو اب ذہن میں نہیں رہی۔

وحید میاں کا اخلاق اعلیٰ، طرز گفتگو ملائم اور مزاج میں سادگی تھی۔ چھوٹوں بڑوں نسبت محبت سے پیش آتے۔ عجز و انکسار طبیعت میں بدرجہ اتم تھا۔ برصغیر کے نامور اصحاب رشد و ہدایت سے عقیدت رکھتے تھے مولوی محمد امیر گیلانی (یکہ توت، پشاور) حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری (لاہور) اور شاہ عزیز میاں نیازی (بیلی) وغیرہ سے ان کے روابط تھے۔ تصوف اور تاریخ تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھنے کی بنا پر انہوں نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اور مخدوم صابری کلیری رحمۃ اللہ علیہ، ورحاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور تصوف پر مختلف کتابیں اور مضامین لکھے۔

وحید میاں خیر آباد کے دور آخر کے قلندریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ شاہ مقبول انور قلندر (ف ۶ ذی الحجہ ۱۳۱۵ھ) سے بیعت تھے۔ صابری سلسلہ سے وہ نہایت عقیدت و محبت رکھتے تھے اور آخر میں اپنے نام کے ساتھ "صابری" بھی لکھنے لگے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایک نہایت دلچسپ خط حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کو لکھا تھا۔ ۱۹۲۸ء سے خاص طور سے ان کی توجہ تصوف اور روحانیت کی طرف مائل ہوئی۔ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۸ء میں حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں شریک ہوئے اور دیوان نید محمد سجادہ نشین پاک پٹن (ف ۱۳۵۳ھ ۱۹۳۲ء) نے ان سے خاص تعلق اور محبت و شفقت کا اظہار کیا ہے۔

پہلی بھیت سے بدایوں آتے ہوئے ٹرین کے حادثہ میں ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے اور اسی حالت میں ۱۱ جنوری ۱۹۶۷ء کو وحید میاں کا انتقال ہوا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ) حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب نے آخری دور کی علالت اور انتقال کی کیفیت اپنے نام ان کی صاحبزادی قریشہ بیگم کے ایک خط کی روشنی میں اس طرح لکھی ہے ۲

۱۔ سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر از وحید محمد مسعود (رضا پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۱ء) ص ۶۲ و ص ۲۶ (۲) (نٹ اگلے دیکھیے)

۵ جنوری کو طبیعت خراب ہوئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اس نے کہا کہ سردی کا اثر ہے۔ ۶ تاریخ کو آیت الکرسی کا ورد رہا کہ ایک منٹ کو زبان نہ رکی۔ ۷ کو آیت کریمہ اس طرح پڑھی کہ ایک منٹ کو زبان نہ رکی۔ ۸ کو یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم مسلسل پڑھتے رہے۔ ۹ کو سکوت کا عالم رہا۔ ۱۰ کو سیدھی جانب دیکھ کر کہتے یا خواجہ! الٹی جانب دیکھ کر کہتے یا بابا! اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہتے یا اللہ۔ شام کو کہا کہ اگر میرے بعد کوئی میری اولاد میں سے روئے گا تو میری رُوح کو تکلیف ہوگی، رات کو سات بجے کہا کہ آج ہمیں کسی کی ضرورت نہیں ہے کھاؤ، پیو، خوش رہو اور خود شور یا پیا اور پانی خوب پیا۔ وضو کیا اور نماز پڑھی اور سو گئے مگر میرا بھائی وہیں رہا۔ ۱۲ بجے رات اٹھے اور تین مرتبہ پے در پے وضو کیا اور لیٹ گئے اور میرے بھائی سے کہا کہ مگرے کا دروازہ کھول دو، اس نے کھول دیا۔ پانچ آدمی مگرے کے اندر آگئے دو کو نہایت احترام سے اپنی سیدھی طرف بیٹھنے کو کہا اور تین کو اپنی الٹی جانب بیٹھنے کو کہا۔ پھر سٹمنے دیکھ کر اپنے چہرے کو بالکل سامنے ہاتھ ہلا کر کہا ابھی آتے ہیں ابھی آتے ہیں اور باواز بلند تین بار یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم پڑھا۔ پھر خوب آواز سے کلمہ پڑھا اور تین سانس لیں اور خالقِ حقیقی سے جملے، "رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعة۔"

وجید میاں تصنیف و تالیف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے تاریخ اور تصوف سے ان کو خاص لگاؤ تھا تحقیق کی طرف طبیعت کا خاص رجحان تھا۔ مگر اندازِ تحریر نہایت سنجیدہ اور ادیبانہ ہے بعض مضامین تو بلاشبہ "انشائیہ" کا نمونہ ہیں۔ کبھی شعر بھی کہتے تھے غالباً یہ جوانی کی بات ہوگی نمونہ ملاحظہ ہو۔

علاق عالم محنت آرد توانا ہے تو آپ ہی سب کچھ ہے اور مثل سے بالا ہے

(نوٹ گذشتہ سے پیوستہ) ۱۷ سوانح حضرت ابانیر الدین مسعود گنج شکر (عارف مصنف) از وجید احمد مسعود ناشر رضا پبلی کیشنز۔ لاہور۔

اضداد میں ممکن ہے اثبات میں کامل ہے
 ہر شے کی حقیقت ہے ہر شے سے بڑا ہے
 مشہود تو ہوتا ہے محسوس نہیں ہوتا
 مستور ہے جلوت میں غلوت میں ہویدا ہے
 میں بندہ عاجز ہوں اور عجز پہ نازاں ہوں
 کھڑو جو تری مرضی ہو، مرضی تری اولیٰ ہے
 یہ جدوجہد میری تسکین ہی تسکین ہے
 ہوتا ہے وہی آخر جو کچھ ترا منشا ہے

اس نام کی خاطر سے احمد پہ کرم کرنا
 ناکارہ و بے بس ہے لیکن ترا بندہ ہے

اب ہم وجد میاں کے تصنیفی و تالیفی کام کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

تصوف کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ ہے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی مرحوم نے رسالہ
 "الناظر" لکھتے ہیں تصوف پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر وجد میاں نے
 یہ رسالہ لکھا۔ اس کی اساس و بنیاد امام شعرانی کے رسالت قلم ہیں۔

تصوف کی اصلیت | ۱۹۴۷-۴۸ء میں مسلمانان ہند ایک عجیب دور ابتلا سے
 گزر رہے تھے اس زمانہ میں انہوں نے یہ رسالہ لکھا اور بتایا
 کہ انتشار و ابتلا کے دور میں صوفیہ نے کیسی شاندار خدمات انجام دی ہیں اور انہوں نے ہر حال میں شرع کا ادب
 کیا اور تصوف، کتاب و سنت سے مستحکم اور اخلاق انبیاء و اصفیاء کے سلوک پر مبنی ہے اور احکام شریعت
 پر عمل کرنے کی ہر حال میں پابندی ہے۔ تصوف کے بعض دوسرے نکات و مسائل پر بھی نہایت سلجھے ہوئے
 انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ رسالہ مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اپریل ۱۹۴۹ء میں نو لکھنؤ پریس
 لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

سوانح بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ | انہوں نے اس کتاب میں عقیدت و روایت
 سے ہٹ کر تاریخ و تحقیق کی روشنی میں بابا صاحب

رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا مسودہ بھی اشاعت کی غرض سے خاکسار کو ارسال فرمایا میرے چھوٹے بھائی مرحوم محمد نعمت اللہ قادری (دف ۲۲) نے ۱۹۸۱ء نے اہتمام کے ساتھ پاک اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع کیا اور علمی حلقوں میں کتاب مقبول ہوئی اس کا دوسرا ایڈیشن راقم الحروف کی تحریک پر رصدا پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے محترمی حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب نے تعارف لکھا ہے۔

جمال صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ | مخدوم صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے احوال و آثار کے بارے میں ہم عصر ماخذ تقریباً خاموش ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ان کی شخصیت کو متعین و مقبول بنایا ہے لطف کی بات یہ ہے کہ خود ان کے ملفوظات و مکتوبات میں مخدوم صابر رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی حال یا ذکر تک نہیں ہے و حیدریاں کو اس سلسلہ سے خاص دل چسپی اور وابستگی تھی انہوں نے اس رسالہ میں ان کے حالات کی ترتیب و تدوین کی کوشش کی ہے۔ یہ مختصر سا رسالہ نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے۔

صابری سلسلہ | اس موضوع پر یہ رسالہ مفید اور معلوماتی ہے ۱۹۷۱ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔ و حیدریاں نے ایک تنقیدی مضمون بعنوان "صابر کلیر کے تذکرے" بھی لکھا تھا جو ہم نے رسالہ "بصائر" کراچی (جلد ۶ شماره ۱-۲) میں شائع کیا تھا۔

صابری تعلیمات | اپنے موضوع پر مکمل و مدلل کتاب ہے مگر طبع نہ ہو سکی۔

پٹاری | نواب فرید (۱۶۶۶ء) نے ۱۶۲۵ء تا ۱۶۲۸ء میں شیخ نور پور کی تعمیر کی بہت سی عمارتیں اور محل سراہیں بنوائیں اور خود پاک پٹن جا کر بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب تبرکات لاتے اور انہیں اپنی خواب گاہ کے بالاحسن نے محفوظ کیا۔ چونکہ وہ تبرکات پٹاری میں رکھے جاتے تھے لہذا اسی نام سے موسوم ہو گئے اور حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے یوم وفات ۵ محرم کو ہر سال

85240

شیخوپورہ میں ان تبرکات کی زیارت کرائی جاتی ہے شاید یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو کہ نواب مراد کے بیٹے رحیم الدین نے نواب علی محمد خاں (ف ۱۱۶۲ھ) کے پسر چہارم نواب محمد یار خاں امیر (ف ۱۱۸۸ھ) سے جو شعر و تصوف کا ذوق رکھتے تھے، راہ رسم پیدا کی اور شیخوپورہ کی پٹاری کے کچھ تبرکات نواب محمد یار خاں کو پیش کر دیتے جب اہل خاندان کو اس کا رروائی کا علم ہوا تو نوبت کشت و خون تک پہنچی۔

وحید میاں نے "پٹاری" کے عنوان سے ان تبرکات کی تفصیل قلم بند کی ہے یہ رسالہ ۱۹۵۴ء میں

نظامی پریس بلاوں میں طبع ہوا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے نظریہ وحدت الوجود کے مقابلہ میں نظریہ وحدت الشہود پیش کیا۔ وحید میاں نے اس رسالہ میں ہر دو نظریات کو بیان کرتے ہوئے اول الذکر کی تائید کی ہے اس موضوع پر شاہ ولی اللہ دہلوی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی وغیرہ نے بھی رسائل لکھے ہیں۔ یہ تمام مواد ان کے سامنے رہا ہے یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔

اس کتاب میں وسط ایشیا کے علاقوں اور قوموں میں اسلام کی تبلیغ، پس منظر، تاریخ اور اسلام پھیلانے والوں کی کاوشوں اور کوششوں کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں اپنے طور پر پھیلنے کی پوری صلاحیت موجود ہے اور اہل مشرق کی روحانیت پسند طبیعتوں کا بھی اسلام کو قبول کرنے میں خاصا دخل رہا ہے اس کتاب میں مغلوں کے اسلام لانے کا مختصر مگر جامع ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب کے ماخذ زیادہ تر انگریزی اور کم تر فارسی ہیں اس موضوع پر اردو زبان میں یہ اولین کتاب ہے۔ فاضل مولف نے اس کتاب کے لیے مواد اس وقت مہیا فرمایا تھا جب وہ یو۔ پی۔ گورنمنٹ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

” میں یو۔ پی۔ گورنمنٹ میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے

مغلوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا اور متفرق نوٹ جمع کئے تھے۔ چنانچہ فہرست

میں ان سب کتابوں پر نمبر ڈال دیتے ہیں اور اس کتاب کے متن میں ہر اقتباس پر ماخذ کے نمبر کا حوالہ دے دیا گیا ہے تاکہ واقعات کی سزا کا پتہ چل سکے ۱۹۵۲ء میں حبیب میں اس عہدے سے سبکدوش ہوا تو جمع شدہ نوٹوں کو مرتب و منسک کرنے کا خیال آیا۔ (ص ۲)

منصوری کوہ منصور کی میر کے حالات دل چسپ اور ظریفانہ انداز میں لکھے گئے ہیں پہلے مضمون رسالہ نقیب میں شائع ہوا اور بعد ازاں کتابچہ کی صورت میں ستمبر ۱۹۲۰ء میں نقیب پریس بدایوں میں چھپا اور اشاعت پذیر ہوا۔

محبت کی بلندیاں اسلامی تاریخ کے ایک واقعہ کو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے یہ ڈرامہ ۱۹۵۹ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔

نشہ کا اتارنا ہمارا خیال ہے کہ جب ۳۹-۶۱۹۳۷ء میں یو۔ پی میں کانگریسی وزارت وجود میں آئی۔ اس زمانہ میں یہ ڈرامہ لکھا گیا تھا۔ پہلے ہاشمی پریس بدایوں میں طبع ہوا پھر یو۔ پی گورنمنٹ نے شائع کیا۔

آزیری مجسٹریٹ ان کے خاندان اور شہر بدایوں میں متعدد آزیری مجسٹریٹ تھے، خیال ہے کہ ان کو سامنے رکھتے ہوئے ظرافت کے پیرایہ میں اظہار خیال کیا ہے

عقل و عقیدہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی تشریح و تنقید پر مشتمل ہے۔ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔

دھوپ چھاؤں سیاسی ادبی اور ظریفانہ مضامین کا غیر مطبوعہ مجموعہ ہے۔

انتخاب سالہ نقیب میر محفوظ علی بدایونی کے مضامین کا انتخاب جسے الناظر بکٹ بکنسی لکھنؤ نے شائع کیا۔

ادبی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ ہے جس زمانہ میں وہ پارلیمنٹری سیکرٹری تھے اس وقت
گردِ راہ یہ کتاب مرتب و شائع ہوئی چنانچہ ان کے صاحبزادے فرید احمد مرحوم لکھتے ہیں۔

”یہ فیصلہ کیا گیا کہ جناب والد صاحب قبلہ کے صرف وہ مضامین ایک جگہ
 جمع ہو جائیں جو حالیہ ہیں اور قریب قریب لکھنؤ میں لکھے گئے ہیں۔ یہ سب مضامین
 فائلوں کے انبار سے آنکھیں چرا کر اور ملاقات کرنے والے اصحاب سے دامن بچا
 کر جو لمبے میسر آسکے ان میں قلم بند کئے گئے ہیں اور سب کے سب گویا گم دن دیا
 کر لکھواتے گئے ہیں یعنی احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر وقتاً فوقتاً لکھے گئے
 ہیں ممکن ہے کہ ان سے موجودہ زمانے کی روش اور تخیل کا ڈھنگ معلوم ہو سکے
 اور کچھ نہیں تو ان مضامین سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فرائض منصبی کی گونا گوں
 مصروفیتوں کے باوجود ادب کے حسین اور سکون بخش چشمے پر اس کے تشنہ لب پہنچ

ہی جاتے ہیں۔ (پیش لفظ)

گردِ راہ میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔

- ① انسان اقبال کی نظرمیں ② غزل ③ اقبال اور نظریہ سعی و عمل
 - ④ میل ملاپ ⑤ ممبروں کے حقوق ⑥ بندرکاناچ ⑦ طلوع آزادی۔
 - ⑧ بدایوں میں آزادی کے دن ⑨ اکبر کے لطیفے ⑩ فتح مبین ⑪ عید
 - کے موقع پر گلے کی قربانی ضروری نہیں ⑫ مسلمان کیا کریں؟
 - ⑬ دیوالی کا پیغام ⑭ گرونانک صاحب کا فلسفہ ⑮ ایک صلاح۔
- اس کتاب پر تعارف قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے اور یہ کتاب رفیع احمد قدوائی کے
 نام معنوں کی گئی ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۸ء میں نامی پریس لکھنؤ سے چھپا اور جلد ہی دوسرا ایڈیشن

بھی شائع ہوا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہنی جلا اور آزاد ہندوستان کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شیخوپور کے فریدی شیوخ کے اخبار و حالات میں اس خاندان کے مختلف بزرگوں نے لکھا ہے۔ بانی شیخوپور نواب فریدی کے حالات مشہور ادیب

عروج شیخوپور

سلطان حیدر جوش (ف ۱۹۵۷ء) نے "نواب فریدی" کے نام سے لکھے ہیں یہ کتاب ۱۹۱۷ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی ہے۔

وحید میاں کے پردادا شیخ فتح الدین ولد شیخ شمس الدین نے خاندانی حالات پر مشتمل فارسی زبان میں ایک رسالہ ۱۲۶۹ھ میں لکھا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔

” فقیر حقیر فتح الدین بن شمس الدین فریدی فاروقی شیخوپوری کہ ایں چند ورقیت در بیان حال حسب و نسب خود از شیخ شمس الدین تاحضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ و تاحضرت آدم علیہ السلام و چند حالات و بیان دیگر متعلق ایں از کتاب جو اہر فریدی تصنیف شیخ علی اصغر و کتاب انور الثقلین تصنیف نواب کثور خاں و دیگر بزبانی بزرگان خود و دیگر ثقات شیخوپور و بدایوں وغیرہ انچہ کہ در سمع رسیدہ بود در ۱۲۶۹ھ ہجری النبوی صلی اللہ علیہ وسلم مطابق ۱۲۶۰ھ فصلی و ۱۸۵۳ء عیسوی برائے یادگار خود و دریافت بر خورداران اقبال نشاناں شیخ شرف الدین و ذوالفقار الدین و مستجاب الدین بقیدت سلم آوردم؛“

اس رسالہ میں بقول وحید میاں، ستھرے میاں نے اصناف کیا لیکن یہ حالات مختصر و مبہم لکھے گئے ہیں پھر اس میں مزید اصل فقیر حکیم احمد جان مرحوم نے کئے جس کی ایک بوسیدہ نقل قادری یہاں کے پاس بتائی جاتی ہے۔

وحید میاں نے شیخ فتح الدین کے رسالہ کی اساس و بنیاد پر اردو میں ایک کتاب مرتب کر دی ان کی نظر سے سحرے میاں اور حکیم احمد جان مرحوم کے بھی مخطوطے گزرے ہیں۔ وحید میاں نے اس کتاب میں شجرے اپنے زمانہ تک مکمل کر دیئے۔ اس میں کہیں کہیں تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے۔

راقم الحروف محمد ایوب قادری جب اگست ۱۹۷۷ء میں بدایوں گیا تو وحید میاں نے شیخ فتح الدین کا مؤلفہ رسالہ (تذکرہ خاندان شیوخ شیخوپورہ) مع اپنے مسودہ کے مجھے مرحمت فرمایا۔ خاکسار نے ۱۹۸۲ء میں اس مسودہ کو صاف اور مرتب کیا اور جب غور کیا تو ”عروج شیخوپورہ“ سے ۱۹۸۳ء برآمد ہوئے چونکہ اس مسودہ پر کوئی نام نہیں تھا لہذا میں نے اس کا نام ”عروج شیخوپورہ“ رکھ دیا ہے۔ وحید میاں کے ہاتھ کا تحریر کردہ مسودہ میں نے اپنے دوست جمال الدین مونس نظامی لایڈیٹرز و القارئین، نظامی پریس بدایوں) کو دے دیا جنہیں بزرگوں کے آثار جمع کرنے کا شوق ہے۔ ”عروج شیخوپورہ“ کی عکسی نقول سید شہید حسین بدایونی، مونس نظامی اور کفیل الدین فریدی نے مجھ سے لیں۔

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک پر جعفر
تھانیسری، ابوالحسن علی ندوی اور

”سید احمد شہید کی صحیح تصویر“

غلام رسول مہر نے کام کیا ہے۔ سب سے زیادہ ضخیم کام مہر مرحوم کا ہے انہوں نے سید صاحب کے خطوط اور ہم عصر مفصل کتاب منظور السعدا سے خوب کام لیا ہے ان بزرگوں نے عقیدت و ارادت کے قلم سے حسین تصویر کشی کی ہے۔ ضرورت تھی کہ سیاسی و تاریخی پس منظر میں اس تحریک کا مطالعہ و تجزیہ کیا جاتا و وحید میاں نے اسی نقطہ نظر سے یہ کتاب لکھنے کی کوشش کی ہے اور بعض اہم سوالات و نکات اٹھاتے ہیں اور دعوت غور و فکر دی ہے اگرچہ ان کے افذ کردہ ہر نتیجہ سے اتفاق رائے ضروری نہیں۔

یہ کتاب سب سے پہلے ”منادی“ دہلی کے ایک خاص نمبر (ستمبر ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوئی اور اس رسالہ کے مدیر خواجہ حسن ثانی صاحب نے دعوت دی کہ اس مبحث پر جو صاحب بھی اور خاص طور سے غلام رسول مہر صاحب لکھیں گے تو ”منادی“ میں ضرور شائع کیا جائے گا چنانچہ لوگوں نے مہر صاحب سے تقاضا کیا کہ وہ جواب لکھیں انہوں نے عذر کیا کہ ”منادی“ کا مذکورہ شمارہ ان کے سامنے نہیں ہے۔ راقم الحروف نے ”منادی“ کے اس خاص شمارہ کا ذاتی نسخہ مہر صاحب کو پیش کیا بعد ازاں یہ خاص شمارہ اگست ۱۹۶۶ء میں لاہور سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا۔ راقم الحروف چاہتا تھا کہ مہر صاحب اس کتاب پر اظہار خیال فرمائیں مگر وہ طرح دے گئے اور اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء میں ارقام فرمایا۔

” باقی رہا سید احمد شہید کا معاملہ تو بھائی صاحب اس عاجز نے اپنی زندگی کے بیشتر سال اس تحریک کی چھان بین میں گزارے، بے خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ”سید احمد شہید“ کے متعلق اتنی کتابیں شاید کسی نے دیکھی نہ ہوں جتنی میں نے دیکھیں۔ سید شہید کے مقامات جہاد اس تفصیل سے غالباً آج تک کوئی نہ دیکھ سکا لیکن والوں کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ وقت گزر جاتا ہے تو چند الٹی سیدھی باتیں لکھ کر ایک رسالہ چھاپ دیتے ہیں۔ اس نوع کی لغویات میں کون وقت صرف کرے میں کھلے دنوں بیمار ہو گیا نزلہ لسی بخار نے خاص تنگ کیا ابھی صحت کاملہ تصیب نہیں ہوئی۔ بلغم کی تولید اور ایک حد تک انجماد کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ذرا طبیعت صاف ہو جائے تو ان شاء اللہ اس پر بھی لکھنا ہے جس میں از سر نو مسئلہ کے بنیادی حقائق واضح ہو جائیں گے۔ بالفعل انتخابات کے جھگڑوں میں سب لوگ مصروف ہیں۔ ان ہنگاموں میں نہ لمبے مضامین چھپنے کا کسی ہوش ہے اور نہ پڑھنے کا“

اس کے بعد جب مہر صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر سے گزری تو اطمینان ہو گیا کہ اس باب

میں وہ کچھ نہ لکھیں گے لہ

” سر سید مرحوم نے مصلحت غلط باتیں کہی تھیں اور آپ جانتے ہیں کہ وہ دروغ

مصلحت آمیز یہ ازراستی فتنہ انگیز کے قائل تھے۔ میں مجاہدین کی شان و آبرو و بہر حال

قائم رکھنے کا قائل ہوں اگرچہ وہ سابقہ بیانات یا توجیہات سے عین مطابق نہ ہو۔“

راقم الحروف کی درخواست پر وحید میاں نے اپنے حالات بھی لکھے تھے مگر کچھ دنوں کے بعد انہوں نے

اطلاع دی کہ میں نے وہ کتاب ضائع کر دی، خدا کرے اس کا کوئی مسودہ وغیرہ کہیں محفوظ ہو تو وہ ایک

علمی ادبی اور تاریخی شاہکار ہو گا۔ وحید میاں کی مراسلت سیاسی، علمی اور ادبی حضرات سے ہوتی تھی۔ اس کی

بھی ضرورت ہے کہ ان کے خطوط جمع کئے جائیں۔

آخر میں ہم ان کی کتاب سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

سوانح خواجہ معین الدین احمدی ^{رحمۃ اللہ علیہ} برصغیر میں سب سے پہلے مسلمانوں کے قدم نہ دھو کر ان میں پہنچے اور محمد بن قاسم نے اس علاقہ میں اسلام

روشناس کرایا۔ دوسرا دور غزنویوں کے عہد اقتدار سے شروع ہوا۔ دولت غزنویہ میں موجودہ پاکستان کا کم و بیش تمام

علاقہ شامل تھا۔ سیاسی اقتدار اور علماء و مشائخ کے قیام اور گوششوں کی بدولت جلد ہی یہاں اسلامی معاشرہ کو

تقویت حاصل ہوئی۔ جگہ جگہ صد ہا مساجد اور مدارس قائم ہوئے۔ عربی فارسی کی نشر و اشاعت ہوئی اور لاہو ایک اسلامی

شہر بن گیا۔ غوفی نے اپنے تذکرہ لبالب باب میں ایک باب فضلائے غزنین و لاہور پر لکھا ہے۔ ان شعرا میں ابو الفرج

رونی (ف تقریباً ۵۸۰ھ مسعود سعد سلمان ۵۱۵ھ) مشہور شاعر ہیں ان دنوں کے دیوان زیور طبع سے راستہ ہو چکے ہیں۔

اس زمانہ میں لاہور میں شیخ حسین زرنجانی، حضرت داتا گنج بخش اور شیخ اسماعیل محدث

لہ افادات مہر مرتبہ ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی (لاہور ۱۹۷۲ء) ص ۲۳۱-۲۳۲

جیسے صوفیہ و علما مقیم ہیں اور وہ تبلیغ و تذکیر کے فرائض انجام دے کر ان علاقوں میں اسلام کو سر بلند کر رہے تھے ان ہی بزرگوں کی کوششوں سے برصغیر کی مختلف قومیں اور قبیلے مشرف باسلام ہوئے اور بہت سے خاندان اور صاحب حیثیت افراد مختلف دیار و امصار سے لاہور میں سکونت پذیر ہوئے اور انہوں نے اسلامی معاشرہ کو تقویت دی۔

جیسا کہ ہمیں خاں لاہوری لکھتے ہیں

این سلسلہ ورود دانشمندان از افغانستان و ترکستان و ایران بہ پایہ تخت لاہور غزنویاں از عصر مسعود اول (بن محمود غزنوی تا آخر عصر ابراہیم غزنوی یعنی از سال ۴۲۱ھ تا ۴۹۲ھ تقریباً ہفتاد سال ادامه داشت تا آنکہ یک جم غفیر از دانشمندان و سخنوران فارسی گویاں در لاہور مستقلاً سکنی گزیدند

سید ہاشمی فرید آبادی پورے غزنوی دور پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں

” نئے پایہ تخت لاہور میں ہم کئی اول درجہ کے صاحبان علم و فضل اور معیاری شعرا کے نام سنتے ہیں جو دربار خسرو ملک کے متوسل تھے... بہر حال لاہور ہی سے امام صنعانی جیسے بزرگ استاد حدیث اور آداب الحرب و الشجاعت کا مشہور مصنف فخر مدبر مبارک شاہ منسوب کئے جاتے ہیں۔“

علماء اور صدور میں چند نام ان کی شعر گوئی کی بدولت سلامت رہ گئے جیسے

(۱) فصیح العجم العجوبۃ الزمان "سراج الدین منہاج" (۲) ثقفہ الدین جمال الفلاسفہ

یوسف ابن محمد در بندی (۳) شہاب الدین محمد ابن رشید محتاج (۴) یوسف ابن

۱۔ تاریخ شعرو سخنوران فارسی در لاہور از ہمیں خاں لاہوری (نیشنل بک ہاؤس کراچی ۱۹۷۱ء)

۲۔ مائثر لاہور از سید ہاشمی فرید آبادی (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۶ء) صفحہ ۱۳۵

نہر کاتب اور (۵) ضیاء الدین عبدالرافع طیب، ایک باکمال انشا پر داز اور شاعر جسے خسرو ملک نے قید اور آخر میں قتل کر دیا (۶) نصر اللہ فرقدی تھا۔ خاص دہلی کے شعرا میں علی ابن عمر اور ابو بکر خسروی کا تذکرہ ملتا ہے۔

غوری حکومت کے قیام کے ساتھ ساتھ برصغیر میں چشتیوں کا داخلہ ہوا اور ان کے قائم رہنا اور اس سلسلہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہیں۔ انہوں نے دہلی ہند میں شجر اسلام کو بار آور کیا۔ ان کی قربانیاں اس اعتبار سے بے مثال ہیں کہ وہ رائے پتھورا کی راجدھانی کفرزار اجمیر میں بیٹھ کر اصلاح معاشرہ میں مشغول ہو گئے۔ لوگوں کو اللہ کے پیام سے روشناس کرنے لگے اور گویا "خُلُونِ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا" کا منظر پیش کر دیا۔ انہوں نے اپنے خلفاء کو حجرات، دکن اور شمالی ہند میں پھیلا دیا اور اصلاح و تبلیغ کی تحریک برپا کر دی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے احوال و آثار ہم عصر ماخذ اور تاریخی نوشتوں میں محفوظ نہ رہ سکے لیکن تعلیم اور اثر و نفوذ کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ سیر الاولیا پہلی کتاب ہے جس میں حضرت خواجہ کا ذکر تبرکاً ملتا ہے۔ فوائد القواد اور خیر المجالس کے ذریعہ بات آگے بڑھتی ہے۔ سیر العارفین پہلا تذکرہ ہے کہ جس میں حضرت خواجہ کے حالات قدرے تفصیل سے پیش کئے ہیں اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے شاید یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو کہ سیر العارفین کے مؤلف نے سیر الاولیا۔ فوائد القواد اور خیر المجالس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے اور مشائخ چشت سے منسوب دیگر ملفوظات ایس الارواح دلیل العارفین، فوائد السالکین، اسرار الاولیا، راحت القلوب، افضل القوائد، اور مفتاح العاشقین وغیرہ کا کوئی حوالہ یا ذکر نہیں کرتا۔ ہمارا خیال ہے کہ یا تو یہ ملفوظات اس وقت تک وجود ہی میں نہیں آئے تھے یا جمالی نے ان کو خود ہی مسترد کر دیا۔

ظن غالب ہے کہ یہ مواد دور مغلیہ میں وجود میں آیا کیونکہ اکبر اعظم نے پیادہ پا اجمیر جا کر مرکز

اجمیر کی اہمیت میں اضافہ کر دیا۔ روسا، امراء اور شاہزادگان کی توجہ ہوئی اکبری اور شاہجہانی تعمیرات اس کا بین ثبوت ہیں بہر حال عہد سلطنت میں یہ صورت حال نہ تھی۔ تاریخ فرشتہ اور آئین اکبری وغیرہ میں بھی حضرت خواجہ کا ذکر ملتا ہے۔

اردو زبان میں حضرت خواجہ کے حالات بعض غیر معروف مصنفین نے عقیدت و ارادت کے انداز میں لکھے اور غالباً عبدالباری معینی اجمیری پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ السلف (۱۹۲۵ء) لکھ کر تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر عبدالباسط ایم۔ اے لکھتے ہیں یہ

”تاریخ السلف ایسی کتاب ہے جو اردو لٹریچر میں ایک نرالی حیثیت رکھتی ہے جناب مولوی عبدالباری صاحب معینی اجمیری نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات پر تنقید کی ہے اور انہیں تاریخ کی روشنی میں لانے کی کوشش کی.... مصنف موصوف نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات پر تاریخی اصول سے روشنی ڈالی ہے“

اس طرح کی دوسری کوشش خادم حسن زبیری نے معین الارواح (۱۹۵۳ء) لکھ کر کی وہ بھی تاریخ و تحقیق کی روشنی میں آگے بڑھے ہیں اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے ایک مفصل اور ایک مختصر صغیر کی تہذیبی و ثقافتی تاریخوں میں بھی حضرت خواجہ کے حالات اور تعلیمات کا ذکر ملتا ہے اس سلسلہ میں سید صباح الدین عبدالرحمن کی بزم صوفیہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تاریخ دعوت و عزیمت اور شیخ محمد اکرام کی آپ کوثر قابل ذکر ہیں مگر تعجب ہے کہ مولف آپ کوثر نے ایک شخص ”معین الدین تو لکی“ کو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ قرار دے دیا۔ طبقات ناصری کی واضح عبارت ملاحظہ ہو

۱۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۲۶ء ص ۱۱۲

۲۔ طبقات ناصری از منہاج سراج (مرتبہ عبدالحی حبیبی) (کابل ۱۳۳۲ھ ش) ص ۴

اس مؤلف نے ایک معتبر آدمی سے سنا کہ جو
 توک اور پہاڑی علاقوں کے شہروں کا سر پر آورد
 شخص تھا اس کا لقب معین الدین تھا وہ کہتا تھا
 کہ میں اس لشکر میں سلطان غازی کے ہمراہ تھا
 اور اسلام کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سواری
 تھی۔

ابن داعی از ثقہ شنید کہ از معارف بلاد
 توک و جبال بود لقب او معین الدین
 اومی گفت کہ من در آن لشکر با سلطان
 غازی بودم، عدد سوارش کر اسلام
 در آن وقت صد و بیست ہزار گریستوان بود
 شیخ اکرام نے ثقہ از معارف بلاد توک و جبال کو معلوم نہیں کس بنیاد پر حضرت خواجہ
 معین الدین چشتی اجمیریؒ تصور کر لیا۔

وجید میاں (شیخ وجید احمد سعود) نے نہایت دقت نظر، محنت اور عصری و تاریخی منظر
 میں تحقیق و تدقیق کے ساتھ حضرت خواجہ کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ اس موضوع پر فارسی اردو اور
 انگریزی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کے پیش نظر رہا ہے وہ تاریخ کا صحیح ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے
 نقل و نقل کی روایت کو رد کرتے ہوئے درایت کی روشنی میں حضرت خواجہ کے صحیح حالات پیش کرنے کی
 کوشش کی ہے۔

ان کی کتاب سوانح خواجہ معین الدین اجمیریؒ ایک مفصل مقدمہ اور بائیس ابواب پر مشتمل
 ہے متن کتاب میں حسب موقع خاص خاص مآخذ پر تنقید و تبصرہ بھی کیا گیا ہے جس سے ان کی دقت نظر اندازہ
 ہوتا ہے۔

کتاب کا مقدمہ اور اس کا تیرھواں باب تصوف اور تاریخ تصوف کے اعتبار سے نہایت
 اہم ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر انہیں کامل عبور حاصل ہے ان کے دلائل نہایت واضح
 ہیں۔ تصوف قبل از اسلام، دور صحابہ، تدوین حدیث مشاہرات صحابہ، خلافت امویہ و عباسیہ، ائمہ اربعہ

لے ملاحظہ ہو آپ کو ترازی شیخ محمد اکرام (فیروز سنز، لاہور ۱۹۵۲ء) ص ۲۲۶۔

کی دینی خدمات، عباسی دور میں مختلف مسائل و نظریات کا ظہور اور ان کا رد، تصوف کا تحریک کی صورت میں ظاہر ہونا اور اس کے ارتقا پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وحدت الوجود پر عالمانہ اور محققانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔

حضرت خواجہ کے نام، مقام پیدائش، سنہ پیدائش، سفر، ہندوستان میں آمد، تبلیغ و اثاثت، اخلاق و عادات غرض حیات خواجہ کا ایک حسین مرقع پیش کیا ہے۔ بلاشبہ فاضل مولف کی مہایت کامیاب کوشش ہے۔

۱۹۶۰ء میں جب خاکسار بدایوں گیا تو انہوں نے اس کتاب کا مسودہ خاکسار کو مرحمت فرماتے ہوئے کہا۔

سپردم بتو مایہ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

میں نے ۱۹۶۱ء میں یہ کتاب سلمان اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع کرادی مقام سرحدی کہ علمی و تاریخی حلقوں میں اس کتاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ عرصہ سے یہ کتاب نایاب تھی جناب محترم حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کی تحریک پر میاں محمد زبیر احمد صاحب قادری سجادہ نشین حضرت دانا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ (رضا پبلی کیشنز لاہور) سے نہایت آب و تاب سے شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کامیابیوں اور کامیابیوں سے نوازے۔

محمد ایوب قادری
۲۸ اگست ۱۹۸۳ء بروز اتوار

A/174/N
نارخہ ناظم آباد، کراچی

اے فقیر میاں زبیر احمد نے یہ تعارف جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم سے جناب وحید احمد مسعود رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف "سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ" کیلئے لکھوایا تھا۔ بعد میں کتاب کی کتابت ضیاء القرآن پبلی کیشنز کو دے دی گئی۔ مگر انہوں نے یہ تعارف چھاپنا گوارا نہ کیا۔ کیوں؟ واللہ اعلم۔
اب جناب وحید احمد مسعود کی نئی تصنیف "سوانح مخدوم علامہ الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ" کے ابتداء میں شامل کر دیا گیا ہے۔ جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے خط کا عکس اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۹۸۲۸
۸۳

A/174/N

نارنگہ ناظم آباد
راچی ۲۳

خدا برحقم سب سے
السلام علیکم

اسد پر زاری کر رہی ہوں۔ آپ سے تمہیں پڑھنا

میں مقدم بصورت تعارف سراج

سوانح نورت حور بنت سنن الدین لکھنوی

حاضر خدمت ہے۔ میں تمہیں ارشاد دہری

رسخا اس کی تہ عذرت خواہ ہوں۔

آپ دیکھیں گے اس میں کتنی محنت لگائی ہے

بہر حال یہ تعارف خدایہ حکیم کو پڑھنا

موجب کو ضرور پڑھو اور اور

تعبت کی محنت کا خاص جہان رہیں۔

ایسی بیخون حکیم کے متعلق سو دنہ پڑھیں

اسد پر زاری نورت حور بنت سنن الدین

جو ایک حور ز طبع کہتے

حکیم اب اللہ سے
اللہ تعالیٰ سے

حالات میں لکھنوی - اہل بکھنوی

حالات میں لکھنوی - اہل بکھنوی

جو اب تہ نظر

حور بنت سنن

سات سو چھیاسی

حق حق حق

آنچه استاد ازل گفت هُماں می گویم

یارب تو کریمی و رسول تو کریم۔ مومن و کافر سب کی حاجت روانی
تو ہی کرتا ہے۔ توجو چاہے تو اٹھے سینہ صحرا سے جباب۔ توتے ہر شے میں ازواج و ضداد
بنائے ہیں اور وحدۃ لا شریک ہے۔ نرالا ہے تو اے مولیٰ کریم نرالی ہیں تیری شانیں۔ ہے
زیبا تجھے سروری برتری۔ سبحان اللہ و بحمدہ۔

یا رسول کریم (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) حضور پر تو مہر لایزالی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم قرآن ناطق ہیں۔ حضور حاضر و ناظر ہیں۔ حضور صاحب خلق عظیم ہیں حضور نے ہی مکمل طور پر
رب العزت کی احدیت و صمدیت کو سمجھایا ہے اور تمام جن و بشر کو سمجھائی ہے۔ حضور صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ دین و دنیا کی بہتری کا واحد ذریعہ ہے۔ زیب دیتا ہے تمہیں
جس قدر اچھا کہیے۔ حضور پر، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آل اہل بیت و اصحاب کو لاکھوں
سلام۔ اللہم صل علی محمد و آلہ بقر حسن جمالہ

صلی اللہ تعالیٰ علیک یا محمد

آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم سے طریقت کے تین سلسلے مشہور و
معروف ہیں۔ سلسلہ خواجگان یا نقشبندیہ۔ یہ سلسلہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ

عمر پر منتہی ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے چلتا ہے۔ اس کی کئی شاخیں ہو گئی ہیں تیسرے سلسلہ کو اولیہ کہتے ہیں حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بغیر خدمت میں حاضر ہونے براہ راست رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فیض پہنچا تھا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیعت تھی واللہ اعلم۔

ہندوستان میں حضرت مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۰۷۵ھ) نے سب سے پہلے لاہور سے تعلیم طریقت کی اشاعت فرمائی۔ ان کی یہ کوشش واحد و شاید ہے مگر انفرادی ہے۔ ان کے اکیس بائیس سال بعد حضرت خواجہ معین الدین حسن سجری چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اجمیر کو مرکز بنا کر ۱۱۹۱ھ میں سلسلہ چشتیہ کی بنیاد رکھی۔ اس کے تیس سال بعد ۱۲۱۲ھ سے حضرت بہا الدین زکریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۲۵۸ھ) نے ملتان سے سہروردی سلسلہ جاری کیا۔ پھر مغربی پنجاب میں حضرت سید محمد غوث گیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۵۹۲ھ) نے سلسلہ قادریہ کی اشاعت کی۔ بعد ازاں اکبری عہد میں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۶۰۳ھ) نے نقشبندی سلسلہ کا اجرا کیا۔

سلسلہ چشتیہ معینیہ کی تیسری کڑی حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کو حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اعظم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی کے خلیفہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بے شمار خلیفہ ہیں جن میں تین بزرگوں کو فوقیت و فضیلت حاصل ہے۔ حضرت جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ اول ہیں۔ ان کا وصال حضرت بابا صاحب کے سامنے ۶۵۹ھ میں ہو گیا تھا۔ ان سے سلسلہ نہیں چلا۔ دوسرے خلیفہ اعظم حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ انہیں ۶۴۶ھ میں خلافت دے کر براہ راست لے کشف المحجوب ۶۸۶ھ کے بعد مکمل ہوئی تھی اس لیے حضرت کے وصال کی تاریخ بعد میں ہونی چاہیے۔

کلیبر کی ولایت سپرد کی تھی۔ دہلی کی خلافت دینے کی افواہ محض الحاقی و فرضی ہے تیسیرے خلیفہ اعظم حضرت سلطان المشائخ سید نظام الدین بدایونی محبوب الہی رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کی بیعت ۶۵۲ھ میں ہوئی تھی اور تین سال بعد خلافت عطا کر کے ولایت دہلی میں متعین کیا تھا۔ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے جتنے بھی تذکرے ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ سب عالم و فاضل تذکرہ نویسوں کی خوش عقیدگی اور شاعری کا نتیجہ ہیں جن کو حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان سب تذکروں کی خامیاں احقر نے ۱۹۶۲ء میں اپنے رسالہ "جمال صابری" میں ظاہر کی تھیں۔ مگر اکثر عقیدت مندوں نے اس کو میری عقلیت پسندی پر محمول کیا۔ لہذا ایسے حضرات سے بصد ادب استدعا ہے کہ ان تذکرہ جات میں جو کرامتیں کہی گئی ہیں ان کی تکذیب و تردید پہلے بھی کی جا چکی ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۹۹۹ھ میں اپنی کتاب "اخبار الانبیاء" میں ان تذکروں کے متعلق سب سے پہلے قلم اٹھایا تھا۔ پھر ۱۸۸۵ء میں سلسلہ جمالی کو ایجاد کرنے کی کوشش میں جناب خلیل الرحمن سراوی صاحب نے ان روایتوں کی وجہ سے حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے وجود سے ہی انکار کر دیا تھا۔ جواب میں صابری حضرات نے اعلان کیا تھا کہ ہم ملفوظات کے مُنکر نہیں ہیں مگر ان مضامین کو مردود کرنے والے ہیں جو پیران ناقص نے مشائخ سے نامزد کر دیتے ہیں۔ غرض اگلے صابری بزرگوں نے مخالفین کے اعتراض دور کرنے کی کوشش کی تھی اور میں معتقدین کے مغالطے دور کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے زمانہ کے صوفیوں نے اغیار کے اثرات و معتقدات قبول کر کے جادو ٹونوں اور سیمیا کو منجملہ کمالات سمجھ لیا تھا اور ان کی دیکھا دیکھی ایسی ہی مصنوعی کرامتیں اپنے بزرگوں سے منسوب کر دیں۔ علم سیمیا حکمے شائقین

۱۔ "قول فیصل" مصنفہ صوفی محمد جان صابری مراد آبادی۔

کی ایجاد ہے۔ وہ اپنی روح کو دوسرے کے قالب میں پہنچا دیتے تھے۔ اپنی آواز دور دراز مقامات تک پہنچا سکتے تھے اور ہر شکل اختیار کر سکتے تھے۔ اس علم کے حاصل کرنے کے لیے سخت مجاہدے کرنا پڑتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ وراثت میں پانی ہوئی عقیدہ مندی مشکل سے دور ہوگی۔ مگر ان شاء اللہ تعالیٰ دور ہوگی اور ضرور دور ہوگی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

اس کتاب کی تدوین و ترتیب میں جن صاحبان نے میری ہمت افزائی کی ہے اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔

- جناب حاجی حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری لاہور ○ جناب حکیم قریش احمد صاحب قدس سرہ سجادہ نشین گنگوہہ ○ جناب حضرت آفاق احمد صاحب قبلہ سجادہ نشین ردولی شریف ○ جناب غلام حسین صاحب مرحوم سجادہ نشین خاتقاہ سلیمانہ پھلواری شریف ○ جناب حکیم اسلام الحق صاحب سجادہ نشین حضرت عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ مروہہ۔ ○ جناب شاہ معین الدین صاحب جعفری سجادہ نشین حضرت عضہ الدین مروہہ۔ ○ جناب خواجہ حسن ثانی صاحب ایڈیٹر منادی دہلی ○ جناب پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے کراچی ○ جناب مرزا وحید الدین بیگ صاحب اجمیر ○ جناب ماسٹر طیب بخش ایم اے رئیس بدایوں ○ جناب ڈاکٹر لطیف حسین صاحب ادیب بریلی ○ جناب ماسٹر شہاب الدین صاحب مدرس شیخوپورہ ○ جناب آل احمد نوری صاحب وکیل بدایوں

ممنونِ کرم بندہ بے درم

غلام غلامان آل محمد

وحید احمد مسعود قطبی وصابری

ابتدائی حالات

آنانکہ وصفِ حُسنِ تو تفسیر می کنند خوابِ ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

اس سے انکار ممکن نہیں کہ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق
 تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قیاسی و سماعی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی عظیم الشان
 شخصیت کا صحیح تعارف نہیں کیا جاسکا۔ ہوایہ کہ جو واقف تھے انہوں نے سکوت اختیار
 کیا اور جو شائق تھے وہ فروعات میں مبتلا ہو گئے۔ ہرزبان پر نئی کہانی ہے۔ ہر کتاب میں
 انوکھی داستان ہے۔ یہ اختلاف یوں ہوئے کہ حقیقت تک رسائی نہ ہو سکی۔ معدوم وہ
 ہے جو نہ پایا جائے۔ جو شے تو اتر کے ساتھ پائی جائے اُسے موہوم کہا جاتا ہے اور موجود
 اس کو کہتے ہیں جو پایا بھی جائے اور تو اتر بھی رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ حضور مخدوم پاک رحمۃ اللہ
 تعالیٰ علیہ کے چرچے ہر زمانہ میں رہے ہیں اور دوسرے سلسلہ کے بزرگوں نے ادب
 تعظیم سے ان کا اعتراف کیا ہے اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ان کا سلسلہ جاری ہے
 نہ صرف یہ بلکہ روحانی صورت سے لوگوں کو مستفیض بھی کیا کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ
 ان کے متعلق ایسی بے سرو پا روایتیں کیوں گھڑی گئیں۔ یہ امر کہ صحیح حالات فراہم نہ ہو
 سکے تو یہ معتقدین اور تذکرہ نگاروں کا قصور ہے۔ انہوں نے اپنے مزاج کے مطابق
 قیاسوں اور تاویلوں سے کام لیا ہے لیکن ظنیات کا حقیقت سے رابطہ و تعلق نہیں ہوا
 کرتا۔

دیکھنے کا تو مزہ یہ ہے سہرا پا دیکھے دیکھ کر پاؤں ترا منہ نہ کسی کا دیکھے

معرفت مشاہدات سے حاصل ہوا کرتی ہے اور اسی سے یقین پیدا ہوتا ہے
مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ ولی تھے لیکن سب ولی ایک سے نہیں ہوتے۔ ولیوں کے
اقسام و مدارج ہیں۔ اس کے علاوہ اہل وطن کا معاملہ اہل ظاہر سے مختلف ہوتا ہے۔ دنیا والے
رُسوم کے پابند ہوتے ہیں اور اولیاء کو رُسوم سے واسطہ نہیں ہوتا۔ طریقت والے نام،
نسب۔ وطن مولد و مدفن سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ تصوف رسم نہیں بلکہ اخلاق ہے۔
چشتیہ سلسلے کے بعض جلیل القدر بزرگوں کے پورے حالات آج تک معلوم نہیں ہو
سکے۔ حضرت خواجہ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد کا نام اور پتہ کسی کو نہیں معلوم۔
خواجہ عبدالواحد بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حسب و نسب پر پردہ پڑا ہوا ہے خبر نہیں کہ
حضرت فضیل بن عیاض کا وطن کس جگہ ہے اور سب سے زیادہ حیرت ہے کہ کسی کو
نہیں معلوم کہ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تید ہیں یا فاروقی ہیں۔ مگر
ان لاعلیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ان بزرگوں کی خلافت۔ ولایت اور عظمت میں کسی
طرح بھی کوئی فرق نہیں آتا۔ اجماع سے ثابت ہے کہ حضرت مخدوم پاک رضی اللہ تعالیٰ
عنہ حضرت بابا صاحب کے بھانجے، داماد اور خلیفہ تھے اور ولایت کلیران کو تفویض
کی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش سے پہلے حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ نے خواب
میں بشارت دی تھی کہ مولود کا نام "علی" رکھنا۔ پھر سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عالم رویا
میں ارشاد ہوا کہ نام احمد ہونا چاہیے۔ وقت تسمیہ کسی بزرگ نے نام علاء الدین تجوڑ کیا بقول
"سیر القصاب" دربار الہی سے مخدوم کا خطاب عطا ہوا۔ اور بابا صاحب نے صابر کا لقب
مرحمت فرمایا۔ ان اسماء کی کثرت میں وحدت جلوہ نما ہے۔ مدعا یہ کہ نام کتنے ہی ہوں مگر

ذات اصل شے ہے۔

ہر کجا نام اوست تر بنیم عاشقان را چہ کار با تحقیق

مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے نسب کے متعلق بھی اختلاف ہے کوئی حسنی کہتا ہے کوئی حسینی خیال کرتا ہے۔ کسی نے انہیں ہندی بنایا ہے اور کسی نے یہودی النسل سمجھا ہے معتبر

یہ ہے کہ سید ہیں۔ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہمشیرہ بی بی ہاجرہ کی شادی حضرت

غوث پاک کے خاندان میں ہوئی تھی۔ لہذا بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ سید ہیں۔ ظاہری اور

کشفی دونوں تذکروں کا متفقہ بیان ہے کہ بی بی ہاجرہ کی شادی غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

پوتے شیخ عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔ لیکن شیخ عبدالرحیم بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عمر میں

تیس سال بڑے تھے۔ لہذا اس سہ ماہی کے فرق کی وجہ سے جلال صابری کے مولف

الہی بخش صابری کی تحقیق ہے کہ بی بی ہاجرہ کی شادی شیخ عبدالرحیم سے نہیں بلکہ ان کے

صاحبزادے شیخ عبداللہ سے ہوئی تھی۔ اب شیخ عبداللہ کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ ماہر انساب

ملا وجہ الدین کا خیال ہے کہ شیخ عبداللہ شیخ فتح اللہ کے صاحبزادے تھے جو امام جعفر صادق رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کی اولاد و امجاد سے تھے۔ اس لیے ان کا تعلق حسینی شاخ سے تھا آگے چل کر ملا صاحب

نے لکھا ہے کہ ۵۹۳ھ میں ان شیخ عبداللہ کی شادی بی بی ہاجرہ سے بمقام کھوٹوال عہد

خلجی میں ہوئی تھی۔ عہد خلجی ۶۸۶ھ سے شروع ہوا ہے اور مخدوم پاک کا وصال ۶۷۹ھ میں عہد یلین میں ہو چکا تھا۔ اندرین

حالات ملا صاحب کی یہ کل روایت قابل تسلیم نہیں ہو سکتی جو لوگ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو ہندی نژاد کہتے ہیں وہ انکی

جلتے ولادت قصبہ ڈگری ضلع حصار قرار دیتے ہیں۔ مگر اس کا ثبوت نہیں اور لکھے بیانات مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ پر منطبق بھی

نہیں ہوتے۔ پیر محمد حسین ولد پیر تاج الدین محمود چشتی اجداد حسنی نے وقائع فرید الدین چشتی، میں مخدوم پاک

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ولادت کھوٹوال میں لکھی ہے اور قطب وقت مولانا اکرم براسوی

نے اپنی کتاب "اقتباس الانوار" میں بغیر کسی حوالے اور سند کے ولادت کی جگہ گنجہ بتاتی ہے۔ جو یہودیوں کی بستی تھی۔ اسی وجہ سے وہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو یہودی النسل تصور کرتے ہیں۔ یہ سب بے پرہیزگی کی کہانیاں ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حسنی سید ہیں ہرات میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے والد شیخ عبداللہ ولد شیخ عبدالرحیم تھے یعنی شیخ عبداللہ حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پرپوتے تھے والدہ کی طرف سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ حسینی تھے۔

مخدوم کے ابتدائی حالات ظاہری تذکروں میں مبہم ہیں مگر کشفی تذکروں میں تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ ظاہری تذکرے پہلے لکھے گئے ہیں اور کشفی تذکرے بعد کی پیداوار ہیں۔ الہامی ہونے کی وجہ سے ان کو ہی معتبر سمجھا جاتا ہے مگر ان کی روایتیں معتمہ ہیں بزعم ہانسی کا ان میں کوئی ذکر نہیں ہے شیخ کبیر کی زوجہ اولے اور زوجہ ثانی کے متعلق صاحب حقیقت گلزار صابری گول ہیں۔ ان کے خلیفہ نے "عمرت فریدی" میں ازواج کی بابت جو لکھا ہے وہ قرین قیاس ہے۔ اور اس کی شہادت تاریخ سے بھی مل جاتی ہے لیکن صاحب حقیقت گلزار صابری شیخ کبیر کی اہلیہ کو بلین کی صاحبزادی بتاتے ہیں اور یہ قطعی غلط ہے۔ بہر حال امتثال امر کیلئے گلزار حقیقت صابری سے کچھ اقتباس اگر یہاں پیش کر دیا جائے تو اہل نظر اس سے خود رائے قائم فرما سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو :-

حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت انس بن مالک، حضرت عبدالعزیز بن حارث رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اپنے اپنے جداگانہ مکاتیب میں یہ روایت تحریر فرماتی ہے کہ حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والصلوات ۱۳ ربیع الاول سالہ کو جمعہ کی رات میں بعد فراغ نماز عشاء ہمیں

ہمراہ لے کر مسقط کی جانب روانہ ہوتے۔ کچھ دُور چل کر ایک درخت کے نیچے قیام فرمایا پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کچھ پہل قدمی فرمائی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ حضور کے بعد سلسلہ کی تعلیم کس طرح چلے گی۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تیری اُمت سے اولیا پیدا کروں گا۔ اُمت کے لوگ تعلیم طریقت کے سلسلے میں پریشان نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تحقیق کے ساتھ کہتا ہوں کہ خداوند جل علی خالق ارواح نے عالم ازل میں تمامی ارواح کو چار حلقوں میں کھڑا کیا اور جملہ ارواح کو مدارج عطا فرمائے۔ اس وقت مخدوم علی احمد صابر کو مہر ولایت پس پشت سیدھے شانے کے پیچھے۔ جگر کے اوپر کہ یہ مقام فنا فی اللہ کا ہے۔ لگائی۔“ حضرت عمر فاروق نے التماس کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ روح کس زمانہ میں ظہور پذیر ہوگی اور اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ ارشاد فرمایا کہ یہ اولاد علی المرتضیٰ میں حسنی و حسینی ہوگا۔ اپنے وقت کا لاثانی مجدد ہوگا اس کا ظہور چھٹی صدی ہجری میں ہوگا۔ شان جمال سے شان جلال زیادہ ہوگی۔“ اسی طرح حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۱۱ رجب المرجب ۴۸ھ کو اپنے مکتوب نطاب ”کشف الغیوب“ میں پوری تفصیل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ عالم روایا میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بتایا کہ..... یہ دوسری روح جو میرے بائیں زانو پر ہے اس کا ظہور دائیں زانو والی روح (یعنی غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد ہوگا۔ اس کا نام مخدوم علی احمد صابر ہوگا۔ اس کو ولایت اتم کا درجہ حاصل ہوگا۔ اس کی ولایت قہر کی شان ہوگی.....“ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مکتوب نطاب ”کربۃ الوحدت“ میں کہا ہے کہ حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خواب میں فرمایا کہ اے فرزند خدا تے عز و جل نے مجھ کو حسن و حسین کے عوض میں ایک نم کو اور دوسرے

علی احمد صابر کو عطا فرمایا ہے۔ اور قریب ہے کہ عبد الوہاب اور عبد الرحیم کے (جو تیری اولاد ہیں) گھر میں ظہور پذیر ہوگا۔ ان حضرات کی مسلسل پیشین گوئیوں کے علاوہ حضرت بابا صاحب کے والد مولوی محمود سلیمان رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوب نطاب میں رقم طراز ہیں کہ انہوں نے اپنے دوست حضرت محمد اسحاق ہراتی کو تحریر فرمایا تھا کہ میں نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ شہنشاہ ہر دوسرا صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم مجھے ارشاد فرما رہے ہیں کہ عبد الرحیم اولادِ غوث پاک محی الدین جیلانی رحمۃ اللہ علیہ شہر ہرات میں آتا ہے تم اپنی دختر نیک اختر موسومہ ہاجرہ کا نکاح اس کے ساتھ کر دینا، حضرت عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوب نطاب "مصور الودود" میں لکھتے ہیں کہ گیارہویں ذی قعد ۱۵۴۱ھ کو دو شنبہ کے دن سہ پہر کو عبد الرحیم عبد السلام پیدا ہوئے۔ وہ پیدا ہوتے ہی مجذوب تھے۔ اسی وجہ سے ظاہری تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔ حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ پیار میں انہیں "میرے مست مجنون جلالی" کہا کرتے تھے۔ جب انکی عمر اٹھارہ سال کی ہوتی تو میں نے بیعت توبہ کرانی اور امامت ارشاد سے ایک ہی وقت میں شرف کر دیا۔ اب جذبہ اتنا بڑھا کہ حواس و عقل نے جواب دے دیا۔ تیرہ دن کے بعد ۱۵۵۸ھ کی شب پنجشنبہ میں تہجد کے وقت بغیر کہے سنے ایک سمت کو چل دیئے۔ اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ پریشان ہو کر میں علیم اللہ ابدال کو ان کی تفتیش و حفاظت کے لیے مقرر کیا۔ گیارہ ماہ بعد ۱۵۵۹ھ میں عید الاضحیٰ کے دن بروز شنبہ غشا کی نماز کے قبل علیم اللہ ابدال خبر لایا کہ پتہ چل گیا۔ ہرات میں محمد اسحاق کے مکان میں مقیم ہیں اور طبیعت اصلاح پر ہے۔ شاہ عبد الرحیم نے خود اپنی کتاب "الوزار الشہود" میں لکھا ہے کہ بتاریخ پنجم ماہ ذوالحجہ ۱۵۵۹ھ کو چہار شنبہ کو ظہر کے وقت ہرات میں داخل ہوا۔ محمد اسحاق نے برطی تعظیم کے ساتھ اپنے یہاں ٹھہرایا۔ پھر

انہوں نے میری آمد کی خیر حسب وعدہ مولوی محمود عرف سلیمان کو بمقام کھوٹوال لکھ بھیجی۔
 کچھ عرصہ بعد وہاں سے شیخ فرید شکر گنج کا خط آیا کہ مولوی محمود عرف سلیمان نے خوشخبری سن کر
 سجدہ شکر ادا کیا اور جان جان آفریں کے سپرد کہ دی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ حسب مرضی نبوی
 (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) بی بی ہاجرہ کی شادی شیخ عبدالرحیم سے ہو سکے گی، اس وقت بی بی ہاجرہ
 تین سال کی تھیں۔ محمد اسحاق نے دس برس شاہ عبدالرحیم کو اپنے پاس رکھا اور اس عرصہ میں
 وہ علوم ظاہری کی تکمیل فرماتے رہے۔ انوار الشہود۔ ارکان الشہود اور طہرت نامہ سے معلوم ہوتا
 ہے کہ شاہ عبدالرحیم کا نکاح بمقام کھوٹوال، ۱۰ جمادی الاول ۱۰۵۷ھ کو پنج شنبہ کے دن بعد
 نماز عشاء حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر ہوا تھا اور بعد نکاح کھوٹوال میں ان
 کا قیام اٹھارہ ماہ رہا۔ پھر مع اہلیہ محترمہ۔ مولانا ابوالقاسم گمرگامی اور علیم اللہ ابدال کے ہرات
 واپس جا کر محمد اسحاق کے مکان میں فروکش ہوئے۔

مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت کے احوال ظاہری تذکروں میں اس
 طرح مندرج ہیں کہ شکم مادر میں ذکرہ بالجہر کرتے تھے ۱۲ ماہ کے بعد ۱۹ ربیع الاول
 کو شب پنجشنبہ میں تہجد کے وقت تولد ہوئے۔ غسل کے وقت دانی نے ہاتھ لگایا تو اس
 کے جسم میں آگ کا شعلہ دوڑ گیا۔ پھر توبہ و وضو کر کے غسل کروایا۔ اس عرصہ میں مکان
 کی چھت شق ہو گئی۔ مقدس روہیں۔ رجال الغیب غوث قطب و ابدال مبارک بادینے
 کو آئے اور پیشانی پر بوسہ دے کر واپس چلے گئے۔ . . . اب کسی دن اتفاقاً چھت سے
 ایک سانپ گرا مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ . . . صہبہ وقت عت

۱۰ تاریخ کہتی ہے کہ حضرت بابا صاحب ۱۰۶۹ھ میں پیدا ہوئے تھے اور شفقی تذکرہ کا ارشاد ہے کہ شاہ عبدالرحیم کا

نکاح بابا صاحب کی تحریک سے ۱۰۵۷ھ میں ہوا تھا جب کہ ان کی عمر دو سال کی تھی۔ واللہ اعلم۔

کے آثار نمایاں تھے۔ شیر مادر کئی کئی دن کے بعد پیتے تھے۔ رضاعت ڈھائی سال کی ہوتی ہے مگر انہوں نے صرف چھ مہینے دودھ پیا۔ بعد کو سوکھی روٹی اور پانی سے افطار کرتے تھے۔ پانچ سال کے ہوئے تو والد رحلت فرما گئے۔ کم سوتے تھے۔ زمین پر لیٹتے تھے۔ صائم الدہر و قائم الیل تھے۔ ساتواں سال بڑی حسرت میں کٹا۔ والدہ سے کھانے کو مانگا تو کچھ نہ تھا۔ انہوں نے خالی دیکھی چولہے پر چڑھا کر تسلی دی کہ چاول پک جائیں تو کھانا۔ بھوک کی شدت سے بیتاب ہو کر مخدوم نے دیکھی کھول کر دیکھی چاول پک چکے تھے اور ان میں سے نہایت تیز خوشبو نکل رہی تھی۔ والدہ کو سخت حیرت ہوئی کہ چاول کہاں سے آگئے۔ پھر یہ چاول سب میں تقسیم بھی کر دیئے اس طرح کی روزانہ کی کرامتیں دیکھ کر والدہ ماجدہ نے طے کیا کہ روحانی تعلیم کے لیے انہیں بھائی کی خدمت میں لے جایا جائے۔ کشفی تذکرہ کا بیان ہے کہ بی بی ہاجرہ ابوالقاسم گرگامی کی معیت میں اجودھن کو چلیں۔ راہ میں علیم اللہ ابدال ملے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تک پوشیدہ رہ کر خدمت کرنے کا حکم تھا۔ اب علانیہ عمر بھر ساتھ رہے گا۔ غرض یہ قافلہ ۱۵ شعبان ۱۱۹۲ھ کو یہ برکت اسم اعظم ضبیدیہ گیارہ روز میں اجودھن پہنچا۔ اس وقت مخدوم کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ اور لکھا ہے کہ اس سال بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت ملے۔ دو سال ہوئے تھے۔ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوش آمدید کہتے ہوئے فرمایا کہ عالم رویا میں مجھے خبر دی گئی تھی کہ یہ طفل نوخیز اولیاء اللہ میں یکتا و بے مثال ہوگا۔ چنانچہ میں منتظر تھا۔ اب تم سب یہاں تین برس ٹھہرو۔ اس عرصہ میں بلند اقبال کو علوم ظاہری کی تحصیل اور علوم باطن کی تکمیل کروادی جائے گی۔ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوب لطاب میں لکھا ہے کہ برخوردار علماء الدین نے تین سال

۱۱ سال ولادت ۱۱۹۲ھ بتایا ہے اور اجودھن ۱۱۹۲ھ میں پہنچے ہیں۔ اس کو کوئی دلی ہی سمجھ سکتا ہے۔

۱۱۹۲ھ مگر حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت ۱۱۹۲ھ میں ملی تھی۔

عربی فارسی کتب متداولہ - فقہ حدیث - تفسیر - منطق و معانی وغیرہ پڑھیں اور یہ سب علوم اس تیزی سے حاصل کئے کہ کوئی دوسرا لڑکا پندرہ سال میں بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ تین سال میں جب ظاہری علوم کی تکمیل ہو چکی تو بتاریخ ۱۴ شوال ۶۳۳ھ میں بہ عمر گیارہ سال بیعت طریقت سے مشرف فرمایا۔ اور فاتحہ تبرک تقسیم کیا۔ پھر مخدوم کو حجرے میں بٹھا دیا۔ اب بی بی ہاجرہ نے واپسی ہرات کی اجازت مانگی۔ جاتے جاتے ۶۳۳ھ میں انہوں استدعا کی تھی کہ بچے کو کھانے کی تکلیف نہ ہو۔ بہن کو مطمئن کرنے کے لیے اسی وقت صابزاوے کو لنگر خانہ کا منتظم مقرر کر دیا۔ بی بی ہاجرہ نے بوقت وداع یہ بھی کہا تھا کہ اس کی شادی کر کے بارہ برس کے بعد میں پھر یہاں آؤں گی۔ اپنے مکتوب نطاب سر العبودیت میں بابا صاحب نے لکھا ہے کہ گیارہویں ذی قعدہ ۶۳۳ھ کو بروز جمعہ فجر سے پہلے علی احمد کے رونے کی آواز میں تے سستی۔ سمجھا کہ والدہ کی جدائی کی وجہ سے رو رہا ہے۔ لیکن دریافت کرنے پر وجہ یہ بتائی کہ دنیا مجھ سے چھوڑانی جا رہی ہے۔ حکم ہوا ہے کہ آئندہ بجز اولیاء اللہ اور رجال الغیب کے کوئی تیرے پاس نہیں آئے گا۔ غرض اس کیفیت میں مستقل طور پر محویت طاری ہو گئی اور ذات مطلق کے سوا کسی دوسری طرف توجہ نہیں رہی۔ سر العبودیت میں یہ بھی تحریر ہے کہ، محرم سنہ ۶۳۳ھ کو بروز شنبہ وقت زوال میرے ۱۱ سالہ فرزند نعیم الدین نے مخدوم کے حجرے کے اندر جھانکا۔ اسی وقت خون کی قے ہوئی اور جان بحق ہو گیا یکم صفر ۶۳۳ھ بروز جمعہ المبارک دوسرے سالہ فرزند فرید بخش نے حجرے کے رُخ پیشاب کر دیا تو بچھونے سے کاٹا اور ایک پہر کے بعد دم توڑ گیا۔ بارہویں صفر ۶۳۳ھ کو میرے تیسرے بائیس سالہ لڑکے عزیز الدین نے بھنڈاری کی ممانعت کے باوجود وقت سے پہلے لنگر تقسیم کر دیا۔ جب مخدوم بجا آمد ہوئے اور یہ قصہ سنا تو فرمایا۔ لنگر باقی نہیں رہا مگر عزیز الدین باقی ہے۔ اسی وقت عزیز الدین کی روح پرواز کر گئی اور گھر

میں کہرام مچ گیا۔ علیم اللہ ابدال نے فی الفور ہرات پہنچ کر ان حادثات کی بی بی ہاجرہ کو خبر کی۔ بی بی ہاجرہ ۱۹ جمادی الاول ۱۳۱۲ھ کو اجدو دھن آئیں۔ مرحوم بچوں کی تعزیت سے فارغ ہو کر مناسب موقع پر صابرا کے کی لاغری کا ذکر کیا۔ جواب دیا تمہارے سامنے لنگر خانہ کا منتظم مقرر کر دیا تھا۔ انہیں کھانے کی کیا کمی تھی۔ مخدوم پاک نے فی البدیہ عرض کیا مگر کھانے کی اجازت کب دی تھی۔ بابا صاحب یہ جواب سن کر خوشی سے اچھل پڑے۔ علی احمد کو پیار کیا اور صابرا کا خطا دیا۔ بہن صاحبہ کی تسکین یوں کی کہ یہ کھانے کے لیے پیدا نہیں کئے گئے ہیں۔

جب بی بی ہاجرہ نے صابرا کے لیے پیغام دیا تو حضرت نے فرمایا انہیں شادی کی ضرورت نہیں ہے لیکن ہمیشہ کے اصرار سے کرنا ہی پڑی۔ لہذا ۲۱ شوال ۱۳۱۲ھ کو ماہین عصر و مغرب نکاح پڑھوایا گیا۔ شب کو والدہ ماجدہ نے دولہن کو حجرے کے اندر پہنچایا۔ نوشہ صاحب مراقبہ فنا سے ہوشیار ہوتے تو پوچھا تم کون ہو۔ عرض کیا کہ آپ کی زوج ہوں۔ فرمایا خداوند ذوالجلال والا کرام فرد ہے اور ان جھگڑوں سے پاک ہے یہ الفاظ منہ سے نکلنا تھے کہ زمین سے ایک شعلہ اٹھا اور دولہن کو خاک تر بنا گیا۔ (ایک روایت یہ بھی ہے کہ دولہن الوار کی تاب نہ لاسکیں اور مر گئیں) اس روح فرسا واقعہ پر والدہ نے مخدوم کی پشت پر دو ہتھ مارا کہ اے سوختہ سامان تیرے ماموں کو میں کیا جواب دوں گی۔ ندامت کے ساتھ مخدوم نے عرض کیا کہ مجھے بالکل خبر نہیں کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ آخر کار بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیشہ کو تسلی دی کہ مرضی الہی یہی تھی۔ صبر کرنا چاہیے اس حادثہ اور دو ہتھ مارنے کا اثر یہ ہوا کہ بی بی ہاجرہ بیمار ہو گئیں اور ۲ محرم ۱۳۱۲ھ کو جمعہ کے دن بعد مغرب رحلت فرما گئیں۔ مخدوم حجرے سے تقسیم لنگر کے لیے برآمد ہوئے

۱۔ بی بی ہاجرہ کی آمد اور مخدوم کے نکاح کی تاریخوں میں فرق ہے۔

۲۔ اس سال کشفی دنیا میں محرم جمادی الاقل سے پہلے آیا تھا۔

تو بھنڈاری نے والدہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ سنتے ہی حجرے میں واپس گئے اور ۹ سال تک باہر نہیں آئے۔

اس کشفی بیان میں مندرجہ ذیل اذکار قابل توجہ ہیں۔

① شیخ عبدالرحیم پیدائشی مجذوب تھے۔ انہیں بیعت توبہ اور امامت ارشاد سے نوازنا تعجبات سے ہے۔

② بعد نکاح شیخ عبدالرحیم کھوٹوال میں اٹھارہ مہینے رہے اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سچائے نو ماہ کے بارہ مہینے بعد پیدا ہوئے اس طرح گویا جاتے ولادت کھوٹوال سے

③ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اجودھن پہنچنے سے دو برس پیشتر بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو خلافت کا ملنا مذکور ہے لیکن خلافت ملنے کا صحیح سال ۶۱۳ھ ہے۔

④ صاحبزادے کو جملہ علوم سے تین برس میں فارغ کر دینے کا وعدہ فرمایا تھا مگر اس مدت میں محض ظاہری تعلیم دی۔

⑤ بی بی ہاجرہ ۶۱۴ھ میں ہرات سے اجودھن بارہ برس سے کچھ قبل آئیں شاید حادثات کی خبر سن کر۔

⑥ بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے باوجود انکار کر دینے کے ہمیشہ کے اصرار سے مجبور ہو کر اپنی صاحبزادی کی شادی مخدوم رحمۃ اللہ علیہ سے کر دی۔

⑦ بی بی ہاجرہ کا انتقال صاحبزادے کا نکاح پڑھوا دینے کے بعد محرم ۶۱۴ھ میں ہوا۔ وہ ہرات سے جمادی الاول ۶۱۴ھ کو آئیں گویا ان کی رحلت کے چار پانچ ماہ بعد نکاح ہوا۔

(۸) والدہ کے انتقال کی خبر سن مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نور بس حجرے سے باہر نہیں نکلے نتیجہ یہ کہ وہ منتظم ننگہ بارہ برس سے زائد رہے۔

کشفی تذکروں کی اس بے سرو پائی پر جو اعتماد رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے۔ ظاہری اور کشفی تذکرے متفق ہیں کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آٹھ سال کی عمر میں اجودھن لائے گئے تھے لیکن کشفی تذکرے سے طے نہ کر سکے کہ ۱۱۹۹ھ میں لائے گئے تھے یا ۱۲۰۰ھ میں اسی طرح ان کا اہام جائے ولادت کا بھی تعین نہ کر سکا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت خواجہ غریب نواز اجمیر شریف ۱۱۹۱ھ میں آئے تھے ۱۱۹۹ھ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے ملتان کا دورہ کیا تھا اس وقت مولانا منہاج الدین کی مسجد میں بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نافع پڑھتے دیکھا تھا۔ اس وقت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر بیس سال کی تھی اس حساب سے بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سال ولادت ۱۱۶۹ھ ہونا ہے۔ پھر فندھار میں تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۱۹۳ھ میں مغرب کی جانب طویل سفر پر گئے تھے۔ بیاحت کے بعد ۱۱۹۳ھ میں حضرت بہار الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ سے ملتے ہوئے کھوٹوال آئے اور کچھ دن قیام کر کے حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دہلی گئے۔ وہاں حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ۱۱۹۲ھ میں خلافت مرحمت فرمائی۔ ۱۱۹۳ھ تک وہیں دہلی میں رہے۔ اس کے بعد ۱۱۹۳ھ تک ہانسی میں قیام فرمایا۔ یہاں سے اسی سال یا کچھ دن بعد اجودھن پہنچے اور وصال تک وہیں رونق افروز رہے۔ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مجاہدات و بیاحت کی وجہ سے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی قسم کی ذمہ داری نہ کھوٹوال میں لے سکتے تھے اور نہ دہلی میں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ آٹھ سال کی عمر میں اجودھن لائے گئے اور وہاں تشریف آوری کا سال ظاہری تذکروں کے مطابق ۱۱۹۳ھ کے بعد قرار دیا گیا تو بھونچال آجائے گا۔ البتہ ہانسی میں حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ

علیہ کو فراغت حاصل تھی۔ وہ حضرت بدر الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہوتے تھے۔ حضرت نور ترک رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ سنا کرتے تھے بیوی بچوں کی نگہداشت کرتے تھے اور شاگردوں اور مریدوں کی تربیت فرماتے تھے۔ اسی جگہ اسی زمانہ میں حضرت جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت منتخب الدین رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت سے مشرف فرمایا تھا لہذا بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ یہیں ہانسوی میں لائے گئے تھے۔ اگر ہانسوی میں ان کا سال ورود $۶۲۱ھ$ مان لیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ $۶۱۳ھ$ میں پیدا ہوئے۔

بی بی ہاجرہ کی دوبارہ حاضری سے پہلے بتایا گیا ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تین صاحبزادوں کو اصل کنندہ کر دیا تھا اس سے انکی فنائیت کا پتہ چلتا ہے۔ جب ایسی محویت تھی تو خدا جانے لنگر کا انتظام کس طرح کرتے تھے۔ بی بی ہاجرہ کے دوبارہ آنے کی وجہ نہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی شادی کا تصور ہے۔ نہ تین صاحبزادگان کے حادثات کی تعزیت ہے بلکہ درحقیقت والدہ ماجدہ کے وصال کا سانحہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ $۶۳۲ھ$ کے بعد بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اجودھن میں مستقل طور پر ہو گیا تو حضرت متوکل رحمۃ اللہ علیہ کو والدہ کو لانے کے لیے کھوٹوال بھیجا تھا۔ جب وہ لاہور تھے تو اثناء راہ میں ایک درندہ ضعیفہ کو اٹھالے گیا۔ یہ سانحہ $۶۳۶ھ$ کے قریب وجوار کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ مگر کشفی تذکروں میں ان کا سال وصال $۶۴۴ھ$ درج ہے اور یہ سراسر غلط ہے۔ بھائی سے صاحبزادے کی لاغری کا شکوہ بھی صحیح نہیں ہو سکتا اس لیے کہ بی بی ہاجرہ کی ساری عمر درویشی کے ماحول میں گزری تھی۔ میکہ میں بھی اور سسرال میں بھی۔ پھر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ صاحبزادے کو ابتدا ہی سے کم خوری کی عادت ہے۔ اب رہا شادی کا معاملہ تو بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرما دیا تھا کہ صاحبزادے کی کیفیت شادی سے مناسبت نہیں رکھتی۔ یہ جواب بی بی

ہاجرہ کو مایوس کرنے کیلئے کافی تھا۔ مگر حقائق اور شے ہیں اور ارمان اور شے ہیں۔ مایوسی میں عورت عجیب اشکال پیدا کر لیا کرتی ہے۔ نہایت عاجزی اور ادب سے عرض کیا کہ کیفیات بدلی سکتی ہیں مگر ہماری مفلسی وغریبی نہیں بدلی جاسکتی۔ والدہ اگر حیات ہوتیں تو آپ کا عذر کبھی نہ کرتے۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ اپنی صاحبزادی بی بی خدیجہ عروت شرف النساء کی شادی مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ سے کرنا ہی پڑی۔ یہ صاحبزادی زوجہ اول بی بی نجیب النساء کے بطن سے تھیں۔ بی بی نجیب النساء کا زوجہ اول ہونا "گلزار حقیقت صابری" کے مصنف کا الہام نہیں ہے بلکہ ان کے خلیفہ۔ صاحب "اسرارِ محترت فریدی" کا انکشاف ہے۔ ظاہری تذکرے مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کی شادی بی بی شریفہ سے ظاہر کرتے ہیں جو بی بی ہزبرہ خاتون کے بطن سے تھیں۔ ان ظاہری تذکرہوں میں یہ بھی روایت ہے کہ بی بی شریفہ کے شوہر حضرت عمر صوفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔ بہر حال پہلے ہی دن دلہن کے انتقال ہو جانے کا صدمہ بی بی ہاجرہ کی جان لے کر رہا۔ اور اسی سال ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کا سال وصال اصل میں ۶۳۶ھ اور ۶۳۷ھ کے وسط میں ہونا چاہیے مگر کشفی تذکرہ میں ان کا سال وصال ۶۴۲ھ لکھا ہے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے منتظم لنگر ہونے کی روایت بھی شبہہ سے خالی نہیں۔ ان کا تشریف لانا بہ عمر ۶۳ سال ہانسی میں ثابت ہوتا ہے اور ہانسی میں بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لنگر کبھی ہرگز جاری نہیں ہوا تھا۔ اجودھن کے ابتدائی قیام میں بھی لنگر خانہ کا ثبوت نہیں ملتا۔ عرصہ کے بعد جب اجودھن میں فتوحات کا دروازہ کھلا تو لنگر خانہ بھی وجود میں آیا۔ اجودھن کے لنگر خانہ کے منتظمین میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا ہے۔ "گلزار حقیقت صابری" کا کشفی بیان ہے کہ مخدوم علیہ الرحمۃ نے بارہ سال لنگر تقسیم کیا۔ اس مدت میں مُرشد کے تین صاحبزادوں کو نذر اجل کیا۔ پھر اپنی اہلیہ کو جلا کر خاستر

بنادیا۔ ان بزرگ کے خلیفہ نے اپنے تذکرہ "اسرارِ عترت فریدی" میں صاف لکھا ہے کہ بابا صنا
 رحمۃ اللہ علیہ کے دو صاحبزادے نعیم الدین اور فرید بخش کا انتقال فطری موت سے
 ہانسی میں ہوا تھا۔ اور عزیز الدین کی موت اجودھن میں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے
 کہ صاحبزادوں کی موت کے متعلق مرشد کا کشف صحیح ہے یا ان کے خلیفہ کا۔ صابری تذکروں
 کو علم نہیں کہ یہ تین صاحبزادے تھے بھی یا نہیں اور کس اہلیہ سے تھے۔ گلزارِ حقیقت صابری
 میں ان صاحبزادوں کی والدہ کا نام درج نہیں ہے مگر اسرارِ عترت فریدی میں مرقوم ہے کہ
 بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی شادی بی بی نجیب النساء سے ہوئی تھی۔ یہ جملہ اولاد ان کے
 ہی بطن سے تھی۔ پھر یہ بھی لکھا ہے کہ بی بی نجیب النساء ہی کی وجہ سے بابا صاحب رحمۃ اللہ
 علیہ نے ہانسی کی سکونت اختیار کی تھی۔ لہذا یہ خیال کہ ہانسی میں حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ
 کی وجہ سے قیام رکھا تھا بالکل فضول و غلط ہے۔ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے مرشد
 نے شادی کرنے کی تاکید کی تھی۔ اس کی تعمیل مرشد کے سامنے ہی ہونا چاہیے تھی۔ لہذا جن بی بی
 صاحبہ سے مرشد کی حیات میں شادی ہوئی ان کا نام نجیب النساء تھا۔ بی بی ہزبرہ خاتون
 سے عقد مرشد کے وصال کے بہت بعد میں ہوا تھا۔ قیام ہانسی اور ہزبرہ خاتون کے عقد کے
 درمیان میں جو خلا و وقفہ تھا وہ صاحب اسرارِ عترت فریدی کے کشف نے بجا طور پر پورا
 کر دیا۔ لیکن کسی نے نہیں لکھا ہے کہ دراصل ہزبرہ خاتون کس خاندان سے تھیں اور کس
 کی بیٹی تھیں۔ یہ کہنا کہ وہ بلبن کی صاحبزادی تھیں۔ اس کی شہادت کسی طرح تاریخ سے نہیں
 ملتی ہے

کشفی روایات سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے قیام اجودھن کی مدت ۲۳ سال

۱۰ کے متعلق مفصل بحث سوانح بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ میں ملاحظہ ہو۔

ہے اور واقعاتی طور پر ۶۱۲ھ سے ۶۲۶ھ تک بارہ سال کی ہے۔ مخدوم علیہ الرحمۃ کے حالات جن کو شریعت و طریقت کے معیار پر صحیح کہا جاسکتا ہے کشفی تذکروں کے بیانات سے قطعی مختلف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ برگزیدہ ہستیوں کی پیدائش و تربیت عام بچوں سے مختلف و برتر ہوتی ہے لیکن ظاہری کشفی تذکروں میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کو قیاس و بالغہ کی بنا پر اس طرح ظاہر کیا ہے کہ حقیقت فسانہ بن جاتی ہے اور ان کی خام خیالیاں خود ان کے خلاف شہادت دیتی ہیں۔

خُلاصہ

- ① بی بی ہاجرہ کی شادی شیخ عبدالرحیم سے نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے شیخ عبداللہ سے بمقام کھوٹوال ۶۱۲ھ میں ہوئی اور اسی سال کچھ قبل دہلی میں حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت مرحمت کی تھی اور ۶۱۳ھ میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش کھوٹوال میں نہیں بلکہ ہرات میں ہوئی تھی۔
- ② مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ بعمر آٹھ سال ۶۲۱ھ میں بابا صاحب کی خدمت میں اجودھن میں نہیں بلکہ ہانسی میں لاتے گئے تھے۔
- ③ تین برس کی ظاہری تعلیم کے بعد انہیں ۶۲۴ھ سے روحانی تعلیم دی گئی۔ مجاہدات کرواتے گئے۔ اس زمانہ میں بمقام ہانسی لنگر خانہ جاری نہیں ہوا تھا۔
- ④ ۶۳۴ھ کے بعد بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ مع متعلقین ہانسی سے اجودھن تشریف لے گئے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ وہاں بارہ سال رہے۔
- ⑤ ہانسی یا اجودھن میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ سے شانِ جلالی کا اظہار نہیں

ہوا۔ یہاں کی جلالی داستانیں قیاسی و فرضی ہیں۔

۶) والدہ کی وفات کی خبر سن کر بی بی ہاجرہ دوبارہ ہرات سے ۶۳۶ھ کے

قرب و جوار میں اجودھن آئی تھیں۔

۷) بھائی سے ان کی لاغری کے متعلق کچھ کہنا غلط ہے۔

۸) مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی شادی بی بی خدیجہ سے ہوئی جو بی بی نجیب النساء

کے لطن سے تھیں۔ اہلیہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ناگہانی طور پر شادی کی شام کو

ہو گیا۔ ان کی موت کی وجہ جلال صابری نہیں ہے۔

۹) لنگر خانہ کا اجراء ہانسی میں نہیں بلکہ اجودھن میں ہوا اور وہاں کے منتظمین

میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نام نہیں ہے۔

۱۰) بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے تین صاحبزادوں کا انتقال فطری موت

سے ہوا نہ کہ جلال صابری سے۔

۱۱) حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام بمقام ہانسی اہلیہ اولیٰ بی بی نجیب النساء

کی وجہ سے رہا۔ نہ کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے۔

۱۲) حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ کا وصال ۶۳۶ھ کے آخر میں ہوا

یا ابتداء ۶۳۷ھ میں۔

۱۳) بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ ثانی بی بی ہزیرہ خاتون سلطان بلبن

کی صاحبزادی نہیں تھیں۔ اس کے متعلق تاریخی شہادت نہیں ملتی۔



خلافت

عمر ہا در کعبہ و بیخسانہ می نالد حیات
تازہ بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

شہرت تو یہی ہے کہ حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پیدائشی
مجدوب تھے اور ان کا شمار بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلائق اعظم
میں ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مجاذیب مستحق خلافت نہیں ہوا کرتے۔ حضرت چراغ دہلوی
رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ شیخی کے لائق سالک کامل۔ سالک مجدوب اور مجدوب سالک
ہوتے ہیں۔ مجدوب نہیں ہوا کرتے، "خلافت کا منشا و مقصد سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت ہے
اور یہ کام ظاہری طور پر مجاذیب سے ممکن نہیں۔ راہ سلوک میں مبتدی کو پہلی منزل میں
محض سالک کا خطاب دیا جاتا ہے۔ دوسری منزل میں وہ سالک مجدوب کہلاتا ہے اور تیسرے
درجہ میں وہ قطعی مجدوب بن جاتا ہے اور بدحواس ہونے کی وجہ سے حد شرع سے بھی مستثنیٰ
خیال کیا جاتا ہے۔ اس درجہ سے ترقی کر کے وہ سلوک کی طرف مائل ہوتا ہے اس لیے
مجدوب سالک سے نامزد ہوتا ہے۔ اس درجہ میں اس کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے
کہ رُخ میری طرف نظر کہیں اور۔ اس کے بعد پانچویں منزل میں سالک کامل ہو جاتا ہے
حضرت مخدوم علیہ الرحمۃ کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مجدوب سالک تھے اور اسی
چوتھے درجہ میں انہیں خلافت مرحمت کی گئی تھی۔

دیکھنا یہ ہے کہ بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے خلفاء کو کس طرح کامل و
اکمل بناتے تھے۔ ان کے خلیفہ اول حضرت جمال ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ علم و فضیلت کی سندیں
رکھتے تھے اور خطیب کے عہدہ پر فائز تھے۔ سب سے پہلے فضیلت کی نفی کروا کر ان سے
عہدہ خطابت سے استعفیٰ دلویا۔ پھر ساکب مجذوب کے درجہ میں لائے گئے۔ اس درجہ
کو طے کر کے وہ قطعی مجذوب بن گئے۔ چنانچہ مجذوبیت ہی کی وجہ سے مرشد کی شادی میں
شریک نہ ہو سکے جو ہزبرہ خاتون سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کا داخلہ مجذوب ساکب
کی منزل میں ہوا۔ بعدہ ساکب کامل بن گئے۔ گویا ترتیب وار جملہ مراتب طے کروا کر
خلافت ان کو عطا کی گئی اور بجائے خطیب کے قطب مشہور ہوئے۔ ان کے بھانجے منتخب الدین
کو بھی یہی تمام منازل طے کروا کر خلافت عطا فرمائی تھی۔ ان دونوں بزرگوں کو خلفائے بابا صاحب رحمۃ اللہ

۱ شہاب الدین غوری نے ہانسی فتح کر کے حضرت جمال کے والد حمید الدین کو وہاں کا قاضی
مقرر کیا۔ حضرت جمال ۵۹۳ھ یا ۵۸۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی زوجہ اول کے بطن سے شاہ حامد تولد
ہوئے جو بقول سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ مجذوب مطلق تھے۔ زوجہ ثانی سے صوفی برہان الدین تھے۔
جن کا سال پیدائش ۵۵۹ھ ہے۔ اسی سال حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا تھا۔ حضرت جمال رحمۃ اللہ
علیہ اچودھن میں سات مرتبہ حاضری دی تھی۔ عطیہ خلافت کے ساتھ ان کو خرقہ، عصا، چوہی نعلین اور نسخہ
عوارف المعارف بھی دیا گیا تھا۔ ان کے صرف دو مرید تھے مولانا حسام الدین اندر بیتی اور میران صاحب
تعلقہ دارا گروہا ضلع حصار ان کی ساتویں حاضری پر سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ دوسری مرتبہ تشریف لے
گئے تھے۔ اور وہیں اچودھن میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ حضرت جمال خلافت کسی کو نہ دے پائے
یعنی ان سے سلسلہ نہیں چلا حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ کی عمر ۷۳ سال کی ہونا چاہئے۔

۲ منقول از حقیقت گلزار صابری۔

علیہ میں تقدم و اولیت حاصل ہے۔ ۶۴۶ھ میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ خلافت سے نوانے گئے تھے مگر ان کے حالات سے کسی طرح پتہ نہیں چلتا کہ ان سے سلوک کا درجہ طے کروایا تھا سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت سے سرفراز فرمایا مگر ان کے واردات سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ان سے مجدد بیت کا درجہ طے کروایا تھا۔

اجودھن میں مستقل قیام ہو جانے پر مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ایک حجر مخصوص کر دیا گیا تھا اور وہ حجرہ آج تک ان کے مشاغل اور وجود کی گواہی دے رہا ہے اور صابری حجرے کے نام سے موسوم و مشہور ہے۔ حضرت امام علی سیالکوٹی جب بیعت کیلئے آئے تو ارشاد ہوا کہ ”این علی بہ آن دو علی لاحق باشد و شغل یک جا کنند“ جن دو علی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا وہ علی احمد صابری اور علی بہاری تھے۔ اس حجرے کے مشاغل کے بعد مجدد ساک کے درجہ میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو خلافت دی گئی تھی۔ منکرین برطرف مخالفین کو بھی مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت تسلیم ہے۔ لیکن مخالفین کا کہنا یہ ہے کہ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ نہیں چلا اور جو سلسلہ ان سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل شمسی سلسلہ ہے حضرت شمس الدین پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے تنہا و واحد خلیفہ تھے۔ انہوں نے نہ کبھی اس سلسلہ کے شمسی ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ ان کے متبعین نے کسی طرح ایسا اعلان کیا لہذا معاندین کا مغالطہ بے معنی ہے۔

حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دستور تھا کہ اپنے خلفاء کو دوسرے سلسلوں کے بزرگوں کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے تاکہ تعارف ہو جائے اور ایک دوسرے کے اصولوں کو سمجھ سکیں۔ لیکن تفصیل نہیں بتائی ہے کہ کس خلیفہ کو کس بزرگ کے پاس بھیج دتوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت جمال۔ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نرت سلطان المشائخ کو کسی بزرگ کے پاس نہیں بھیجا تھا۔ ان حضرات کی شہرت و مقبولیت وجہ سے دوسرے سلسلہ والے خود واقف و معترف ہوئے۔ حضرت جمال کے تعلق یہ روایت جو وہ ہے کہ ان پر حضرت بہار الدین زکریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فریفتہ تھے اور انہوں نے بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فرمائش کی تھی کہ میرے سب مرید لے لیجئے اور جمال کو مجھے دے دیجئے۔ ہوں نے جواب دیا کہ تبادلہ جمال میں نہیں ہو سکتا۔ اس روایت کو لطیفہ ہی سمجھا جائے۔
رنہ یہ روایت بے اصل معلوم ہوتی ہے۔

مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خلافت کے متعلق کشفی تذکرہ گلزار حقیقت ما بری میں بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی روحانی کتاب ستر العبودیت سے جو لکھا گیا ہے، وہ لطف سے خالی نہیں۔ لکھا ہے کہ بہ حکم باطن ۶۲۲ھ میں مخدوم صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو میں نے حجرے سے نکالا اور کالمین کی مجلس میں بیعت توبہ اور حوالت خاندان چشتیہ میں مشرف کر کے انہیں کیفیت باطن، مرتبہ سلوک کی تعلیم سے مستفیض کیا۔ اب وہ رات کو اپنے حجرے میں مستغرق رہتے تھے۔ اور دن کو میرے پاس رہ کر اسرار کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ستائیس برس تعلیم لسانی میری سے مراتبات شہنشاہی ولایت کیفیت باطن کی تحصیل کرتے رہے۔
۶۵۰ھ میں بہ حکم حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ رویا میں مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو میں نے اپنے ہمراہ لیا۔ ہم دونوں حضرت شیخ کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے چھپے چھپے چلنے لگے۔ عالم ملکوت سے عالم جبروت کی طرف عروج ہوا۔ وہاں تمام حضرات چشتیہ اور جمیع سلاسل کے اولین و آخرین بزرگ محفل نبوی میں موجود تھے میرے پیرو مرشد قبلہ نے ہم دونوں کو تخت مبارک کے روبرو کھڑا کیا۔ پھر بموجب ارشاد شیخ میں مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کو حضور نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قریب لے گیا۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم نے مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کی پشت پر سیدھے شانہ کی طرف بوسہ دیا۔ اور زبان مبارک سے ارشاد فرمایا "ہذا ولی اللہ پھر تمام حاضرین نے اسی طرح اسی جگہ بوسہ دیا اور وہی الفاظ "ہذا ولی اللہ کہے۔ اتنے میں آنکھ کھلی تو لیلۃ القدر کی کیفیت کے آثار کا عروج ہو رہا تھا۔ بیدار ہو کر میں "علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کے حجرے کی طرف گیا۔ دیکھا کہ خلاف معمول دروازہ کھلا ہوا ہے وہ مرتبہ فنا میں متغرق ہیں اور تمام رجال الغیب۔ نقیب و تداور قطب ان کی پشت پر بوسہ دیتے ہیں اور "ہذا ولی اللہ" کہتے ہیں۔ صبح کو جملہ بزرگ مجھے مبارکباد دینے آئے پھر ان میں سے کچھ چلے گئے اور کچھ ٹھہر گئے (ان سب کی لمبی چوڑی فہرست نام بنام مع ہر ایک کی روحانی کتاب کے درج ہے) جب تمام حاضرین فیضیاب ہو چکے تو میں نے علی احمد صابر کو اپنے پاس بٹھا کر بیعت امامت اور ارشادِ خاندانِ چشتیہ عالیہ سے اپنے ہاتھ پر مشرف فرمایا۔ پھر اپنے ہاتھ سے کلاہ اوڑھائی اور عمامہ ستر باندھ کر مثل خلافت بہ مضمون ولایت کلیر اقلیم ہند سے اور سب حاضرین کو سنا کہ خطاب۔ خطاب باطنی "قطب عالم غیبات الہند الاجلال" شاہ مخدوم علی احمد صابر سے اولیاء ہمعصر کو مطلع کیا۔ اور اسم ظاہری مثال خلافت میں بہ القاب "بادشاہ دو جہاں مخدوم علامہ الدین علی احمد صابر ختم الارواح سلطان اولیا" کے تحریر کیا۔ اس وقت بے اختیار میری زبان سے نکلا "علم ظاہری و باطنی میرا علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ لے چلا اور علم باطن بھی بالکل اسے دیدیا" پھر سات سیر شہد خالص کا شربت فاتحہ ہو کر تقسیم ہوا۔ بعد فاتحہ خوانوں نے راگ شروع کیا تھا کہ طبیعت بادشاہ دو جہاں مخدوم علامہ الدین علی احمد صابر ختم الارواح سلطان اولیاء پر غلبہ حال کا جلوہ ہونے لگا۔ مصلحتاً اس راگ کو موقوف کیا۔ پھر شب کی مجلس میں سنایا گیا "اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت ۱۵۰۰ھ میں دی تھی۔ سر العبودیت میں بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ۱۵۰۰ھ میں

بروز پنجشنبہ بعد نماز چاشت کے سید نظام الدین بدایونی دہلی سے تقویاً چودہ برس کی عمر میں میرے پاس اجودھن آئے اور پانچ روز کے بعد تاریخ ستائیس ماہ مذکور سنہ صدر روز دوشنبہ بعد نماز مغرب کے میں نے اپنے ہاتھ پر بیعت توبہ سے خاندانِ چشتیہ عالیہ میں مشرف کر کے حلیم طریقت سے مستفید کیا۔ سید نظام الدین دس روز بعد حصول بیعت کے میرے پاس پیام کر کے دہلی کو روانہ ہو گئے۔ ایک سال بعد پھر حاضر ہو کر تعلیم کیفیت باطن میں بہ دل و بان متوجہ ہوئے۔ پھر یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۲۶ھ ۱۵ ماہ ذوالحجہ کو روز دوشنبہ بعد نماز فجر کے عطیہ خلافت کے بعد حضرت مخدوم پاک کو ظہیر روانہ کیا گیا تھا۔ حضرت سلطان المشائخ کی روحانی کتاب تقناطیس الوحدت میں بھی مخدوم پاک کے کلیر جانے کی یہی تاریخ درج ہے:

سیر الاولیاء میں ایک نئی اور عجیب روایت ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت ناموں پر مہر لگانے یا خلفاء کا رجسٹر رکھنے کے ساتھ خلافت ناموں کے رد و قبول کا بھی اختیار دیا تھا۔ یہ آئین طریقت کے قطعی خلافت ہے۔ اگر اس حق دہی کو بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اجتہاد سمجھا جائے تو اس کے جواز کی کہیں سے سند نہیں ملتی۔ اسی اختیار کی بنا پر سیر الاولیاء میں ایک بے سرو پا روایت اور بھی ہے۔ اس مجہول روایت میں اس خاص مرید کا نام نہیں ہے۔ اس بے نام و نشان مرید نے بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت کی درخواست کی تھی۔ قبول نہ کئے جانے پر اس مرید نے کہا میں ایسی سند خود بنا لوں گا۔ اور اپنا کام چلاؤں گا۔ اس کو سن کر۔ دروغ بر گردن راوی۔ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بدر الدین اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کو ہدایت فرمائی کہ آئندہ سے اپنی کتابت کے دستخط خلافت ناموں پر کیا کریں تاکہ بیچ عریضے را دریں کار مداخلت نہ باشد آنکھوں میں خاک ڈال کر لکھا ہے کہ شیخِ خاص اپنی مصیبتیں سندے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ سے تصدیق کرانے پہنچا۔ انہوں نے دیکھتے ہی فرمایا کہ تو خلافت

کے لائق نہیں ہے اور اس کی جعلی سند چاک کر دی۔ اب لطف یہ ہے کہ یہ مکار حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ کی شکایت کرنے کے لیے حضور بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں آیا کہ میری سند چاک کر دی۔ حضرت نے جواب دیا کہ جمال کے پھاڑے ہوئے کو ہم جوڑ نہیں سکتے۔ ایسے شخص کو ایسا ہی جواب ملنا چاہیے تھا۔ اس تجاہل عارفانہ کو سن کہ نام نہاد جمالی فخر و مباهات کرنے لگے اور آنکھوں سے معذور عقیدت مندوں نے بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجبوری کو تسلیم کر لیا۔ اب طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہی ناقابل قیاس روایت حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کر دی گئی ہے۔ اس روایت میں حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے یہی نہیں فرمایا کہ آپ خلافت کے لائق نہیں ہیں بلکہ یہ بھی کہا کہ آپ کی تعیناتی بھی دہلی میں غلط ہوئی ہے۔ دہلی آپ کے جلال کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ یہ سنتے ہی مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو جلال آگیا اور کہا کہ میں نے آپ کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ حضرت جمال ہم گئے اور دریافت کیا کہ میرا کس طرف سے منقطع کیا۔ جواب دیا کہ آپ کا سلسلہ چلا ہی کب تھا۔ لہذا اوپر سے منقطع کیا ہے یعنی بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت ختم کر دی۔ ابھی تک سند خلافت کا ذکر تھا۔ یہ دہلی کی تعیناتی کا پروانہ کدھر سے نکل آیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سند خلافت چاک کی یا پروانہ چاک کیا یا دونوں کو پھاڑ ڈالا۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں سے جا کر بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ماجرا بیان کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا۔ تیرا مردان خطانمی شود یعنی حضرت جمال کی نسبت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد فرمایا تم غم نہ کرو۔ اب ہم اپنے ہاتھ سے لکھ کر تمہیں کلیئر کا پروانہ دیں گے۔ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے پروانہ دہلی چاک کیا تھا اور سند خلافت چاک ہونے سے بچ گئی تھی۔ عقل سلیم اس نزاع مانسی کے کسی جز کو کسی بہاؤ تسلیم نہیں کر سکتی۔ میرا خورد کو یہ علم یقینی تھا کہ مخدوم

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بمقام ہانسی بچپن میں لائے گئے تھے اس وقت حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ جوان تھے۔ لہذا یہ ممکن نہیں کہ انہوں نے مرشد کے بھانجے کی دیکھ بھال نہ کی ہو۔ اس لیے رگی و خوردی کے آداب کے نظر اس قسم کا نزاع ممکن الوقوع نہیں مانا جاسکتا اس نزاع اور جمال کے رد و قبول کے اختیار کے متعلق خود سیر الاولیاء کی دوسری روایتوں سے تردید ہو جاتی ہے جو اہل نظر سے مخفی نہیں۔

سیر الاولیاء میں ایک روایت اپنے والد سے سن کر نقل کی گئی ہے کہ علی صابر رحمۃ اللہ علیہ درویشے بود۔ قدم ثابت و نفس گیر داشت۔ ساکن ڈیکری بودے پیوند بخد مت شیوخ عالم داشت و اور از شیخ الشیوخ عالم اجازت بیعت بود پھر بھی لکھا ہے کہ سندیتے وقت یہی فرمایا تھا بھوکا خواہی شد۔ یعنی عیشے خواہد گشت۔ اس کے علاوہ یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ سند کی تصدیق حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کرالینا۔ اسی طرح یوسف ہانسوی کے متعلق بھی ہے کہ ان سے بھی حضرت جمال سے تصدیق سند کے لیے نہیں کہا تھا البتہ حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو رخصت کرتے وقت فرمایا تھا کہ ہانسی میں جمال رحمۃ اللہ علیہ کو اور دہلی میں حضرت منتخب الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اپنی سند دکھا لینا، اس دکھانے میں حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ عقل حیران ہے کہ بھوکا والی دُعا مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر کیے اور کیوں منطبق کر دی گئی ہے۔ بھوکا ویدانت کی اصطلاح ہے اس کے معنی خوش باشی کے ہیں۔ صاحب گلزار ابرار نے اس بنا پر مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خوش باشی کی توجیہ یوں کی ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ پر حیرت طاری رہتی تھی اور حیرت خوش باشی کی علامت ہے اب اگر بھوکا کی صحیح حقیقت سمجھی جائے تو اس کا تعلق تناسخ سے ہے۔ تناسخ میں دو لفظ بھوکا اور بھاگ خاص معنی رکھتے ہیں۔ ویدانتی کرم اور جنم کے قائل ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص اپنے کرم و عمل کے مطابق جنم لیا کرتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے کرموں کے متعلق جنم لینے کو بھاگ

کہتے ہیں اور بھوک کو بلا شرط کے عطیہ غیبی خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن موجودہ ترقی یافتہ ویدانتی بھوک کو بھی بھاگ کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مثلاً سری کرشن مہاراج متھرا میں دیو کی اور ندلال کے گھر تولد ہوئے مگر غیب سے ہدایت ہوئی کہ ان کو بندرا بن جو دا کے یہاں پہنچا دیا جائے اور اس کی نوزائیدہ بچی کو متھرا لے آیا جائے۔ گویا یہ تبادلہ بھاگ نہ تھا بلکہ بھوک تھا۔ راجہ کنس نے پیدائش کی خبر سُن کر اس بچی کو مار ڈالنا چاہا مگر وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر یہ کہتی ہوئی آسمان پر چلی گئی کہ تیرا مرنے والا پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ سری کرشن مہاراج نے کوروں اور پانڈوں میں جنگ کروا کر راجہ کنس کا نام و نشان میٹ دیا۔ اور اس کے جبر و ظلم سے مخلوق کو بچا لیا، یہ ویدانتی مسئلہ وحدت الوجود کو تاسخ سے ہی تعبیر کرنے لگے ہیں مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ غور فرمایا جائے کہ بابا صاحب علیہ الرحمۃ نے علی صابر رحمۃ اللہ علیہ ساکن ڈبکری کو بھوکا کی دعادی بھی تھی یا نہیں۔ پھر تذکرہ نویسوں کی یہ بڑی غلطی ہے کہ اس دعا کو علی صابر ساکن ڈبکری کے بجائے حضرت علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ سے مجیر العقول طریقہ سے منسوب کر دیا۔

حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا دستور تھا کہ اپنے خلفاء کو کسی نہ کسی مدت پر متعین کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً بدرالدین اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اسناد، تعویذ اور خطوط لکھنے پر مامور کیا تھا۔ بعض کو لنگر کا منتظم بنایا تھا۔ اخی مبارک حاضر دربار ہوتے تھے شیخ عیسیٰ کو نجی خدمات دی تھیں۔ خواجہ شیبانی وضو اور غسل کروانے تھے اور کپڑے دھونے تھے حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق مذکور ہے کہ جب اجودھن آنے تو لنگر کے لیے جنگل سے لکڑیاں لاتے تھے۔ ان کے متعلق رجسٹر رکھتے اور مہر لگانے کی خدمت کا حال سوائے سیرالاولیاء کے اور کہیں مسطور نہیں ہے۔ ہانسی کا نزاع محض سیرالاولیاء کی ایجاد ہے اور الحاقی ہے۔ کشفی تذکرہ اسرارِ عترت فریدی کے صفحہ ۱۸۶ پر ندامت و افسوس کے

ساتھ تحریر ہے کہ اس نزاع کا حال مصنف نے بھی اپنی کتاب گلزار فریدی میں لکھا تھا۔ یہ کتاب ۱۳۰۲ھ میں لکھی تھی۔ اس پر دگاہ فریدی سے مثال میں مجھ پر عتاب ہوا پھر بعد میں جناب بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور مخدوم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نوازش سے پورے حالات معلوم ہوئے اور خاص خلافت نامہ مخدوم پاک کی بھی زیارت نصیب ہوئی۔ برادرانِ وطن کی خدمت میں عرض پرداز ہوں کہ ان تہمت ناک باتوں سے پرہیز کرنی لازم ہے عالم مثال میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا خلافت نامہ مجھے دکھایا گیا تھا۔ اس پر پیشینِ حال کے جملہ اولیاء کرام کی گواہی کے دستخطوں کے ساتھ حضرت جمال کی بھی گواہی کے دستخط موجود ہیں۔

مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت ۱۲۶ھ میں مرحمت فرمائی گئی تھی اور اسی سال دربار الہی سے کلیر کی ولایت عطا کی گئی تھی۔ اور وہ فوراً کلیر کو روانہ ہو گئے تھے۔ مجذوب سالک ظاہر سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ان کا قیام اگرستی میں ہوتا ہے تو اجنبی کی طرح رہتے ہیں۔ سارا وقت جنگل میں گزارتے ہیں۔ مخدوم پاک کو دہلی کی ولایت کا دیا جاتا اور اس کا منسوخ ہو جانا محض فریب ہے۔ کلیر کی تعیناتی کا ایک سبب یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ حضور غریب نواز قدس سرہ کے زمانہ میں کلیر کے والی امام الدین دمشقی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ حضرت حضور غوث پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اولاد سے تھے۔ ان کا تقرر ۵۸۹ھ میں ہوا تھا اور اسی سال جنگ کلیر میں شہید ہو گئے۔ معلوم نہیں ان کے بعد ستاون برس وہاں کا صاحب ولایت کون رہا۔ اب ۱۲۶ھ میں یہاں کی ولایت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو دی گئی چونکہ یہ غوث پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اولاد سے تھے لہذا۔

حق بہ حجت دار رسید

خُلاَصَه

مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ساکب مجذوب تھے۔

①

ان کو خلافت و ولایت ۱۳۶۶ھ میں ملی تھی نہ کہ ۱۳۵۵ھ میں۔

②

ان کا تقرّر دہلی میں کہیں نہیں ہوا۔

③

خلافت و ولایت کے فرائض علیحدہ ہوتے ہیں۔

④

نزاع ہانسی کے متعلق سیرالادلیا کی روایتیں الحاقی ہیں۔ میر خورداینی فضول روایت نہیں لکھ سکتے تھے۔

⑤

حضرت سلطان المشائخ بیعت کے لیے اجودھن ۱۳۵۲ھ میں گئے تھے

⑥

مخدوم اس سے پہلے کلیر جا چکے تھے۔ دونوں کی ظاہری ملاقات نہیں ہوئی۔

حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سلسلہ نہیں چلا۔ ان کی اولاد سلسلہ نظامیہ

⑦

میں مدغم ہو گئی۔ اب جو ان کا سلسلہ چلانا چاہتے ہیں یہ محض دھاندلی ہے۔ ان

حضرات نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر جو اعتراض کیے ہیں ان میں

نام کو بھی روحانیت نہیں ہے۔

بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے کسی خلیفہ کی سند پر حضرت جمال کی مہر

⑧

نہیں ہے۔ اور یہ سب سندیں حضرت بدرالدین اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ

علیہ کی لکھی ہوئی ہیں۔



ولایت

ایں شربت عاشقیست خسرو

بے خونِ جگر چشید نتواں

حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر قدس سرہ العزیزہ کو بیعت کے بائیس برس بعد بہ عمر ۲۳ سال ۶۴۶ھ میں خلافت ملی اور اسی سال براہ راست کلیر کی ولایت پر مامور کر دیئے گئے۔ انہوں نے اپنے وصال تک ولایت کلیر کا انتظام کیا اور سلسلہ کی تبلیغ فرمائی۔ اقتباس الانوار میں ہے کہ ”کلیر پہنچتے ہی عبادت اور فیض رسانی میں مصروف ہو گئے اور بعد وصال بھی فیض اسی طرح جاری رہا جس طرح حیات میں تھا۔ اہل مہنود کی روایت کے مطابق کشفی تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت نبوی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) سے قبل ۶۲۸ھ میں دہلی کے راجہ کریم پال نے اس نواح میں ایک شہر بسایا تھا جس کا نام ہردوار گڑھی پک رکھا تھا۔ یعنی خدا کی گڑھی کا راستہ۔ اس راجہ کے لڑکے بکریم پال نے وہاں عالیشان مندر بنا کر سونے چاندی کی مور تیں نصب کیں اور نگرانی کیلئے مہنتوں کی گدی قائم کی۔ یہ کبیٹی ہردوار میں ابھی تک باقی و جاری ہے) عرصہ کے بعد اس شہر کی حفاظت کے لیے جنوب میں کچھ فاصلہ پر بکریم پال کے صاحبزادے راجہ کریم پال نے یہاں قلعہ تعمیر کیا تھا اور کلیر کے نام سے موسوم کیا۔ صحیح طور پر نہیں معلوم کہ مسلمانوں نے اس قلعہ کو کب فتح کیا تھا۔

صابری، کے مصنف ماسٹر امر او حسن قادری صابری کی رائے ہے کہ بنگال جاتے ہوئے بختیار خلیجی نے ۵۹۷ھ میں فتح کیا تھا۔ مگر اس کی تردید تاریخ کے علاوہ اس روایت سے بھی ہو جاتی ہے کہ حضور غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے امام علی دمشقی کو کلیر کا وال بنا کر ۵۷۹ھ میں بھیجا تھا۔ اسی سال مسلمانوں نے کلیر پر حملہ کیا تھا اور امام علی دمشقی کی اسی جنگ میں شہادت ہوئی تھی مگر مذکور نہیں ہے کہ فتح بھی ہوئی تھی یا نہیں۔ تاریخ کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۸۶ھ میں میرٹھ اور کول کی تسخیر کرنے کے بعد ۵۸۹ھ میں قطب الدین ایبک نے دہلی کو دار السلطنت بنایا تھا۔ اس سال وہ اس کے انتظام و انصرام میں مشغول رہا اور کسی طرف فوج کشی نہیں کی۔ محمد غوری نے ۵۹۲ھ میں راجہ جے چند کو شکست دے کر قنوج و بنارس کو فتح کیا تھا۔ اس لیے قیاس ہے کہ فتح قنوج سے پہلے محمد غوری نے ۵۸۹ھ کے آخر میں کلیر کی تسخیر کی تھی۔ بختیار خلیجی والی روایت یوں بھی غلط ہے کہ ۵۹۳ھ میں بہار و بنگال کی طرف حملہ آور ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ کلیر شریف قلعہ تھا۔ ہر دو وار کے غلوت نشین جا تری ممکن ہے کہ قلعہ کے ارد گرد قیام کرنے لگے ہوں اور رشیوں اور مینیوں نے بھی استہان بنا لیے ہوں۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی ہنود سے زیادہ نہیں ہو سکتی کشفی روایت ہے کہ یہاں مسلمان کثرت سے آباد تھے اور یہاں بہت بڑی مسجد بھی تھی جس میں سونے چاندی کے ظروف غسل و وضو کے لیے تھے۔ تذکرہ جات صابری میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت کے لیے لکھا ہے۔ ہمہ وقت مستغرق رہتے تھے اور مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ کلیر میں ان کرامات اور فیض رسائیوں کی تفصیل بتائی گئی ہے کہ حاکم شہر مسمی دموان کی بکری کم ہو گئی تھی تو استفسار کرنے پر حضرت کی توجہ سے بکری کے گوشت کی ہر ہر بوٹی نے باواز بلند بتایا کہ میں فلاں فلاں شخص کے پیٹ میں ہوں۔ دموان معتقد ہو جاتا مگر قاضی

شہر مسمی تبرک نے سمجھا دیا کہ یہ عجیب طلسم ہے۔ یہ بھی لکھا گیا ہے کہ جمعہ کی نماز کے لیے عوام کے علاوہ پانچ سو پاکی سوار علماء و امراء مسجد میں جمع ہوتے تھے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پہلے صف اول میں بیٹھ جاتے تھے اور اپنی ولایت و امامت کا وعظ فرمایا کرتے تھے۔ یہ بات امراء و علماء کو ناگوار تھی لہذا ایک جمعہ کو انہیں صف اول سے اٹھا کر باہر کی آخری صف میں دھکیل دیا۔ اس پر حضرت نے مسجد کو حکم دیا کہ تو بھی سجد کر۔ مسجد کے سجدہ کرتے ہی جملہ نمازی دُپ کر مر گئے۔ اس کے بعد مزید فیض یہ پہنچایا کہ طاعون کی وبا مسلط کر دی۔ اور چھ سال کے استغراق کے بعد کلیر کے گرد بارہ بارہ کو س تک آگ لگا دی۔ یہ جملہ فیوض و کمالات گویا باطل پرستوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے کئے تھے۔ مگر تہی دستان قسمتِ راچہ سودازِ مرشدِ کامل۔ جب سب کچھ بھسم ہو گیا تو سوختہ زمین میں خود ہی تن تنہا بقیہ عمر گزار سی۔ البتہ کچھ ہمسایہ رہ گئے تھے اور عرصہ کے بعد حضرت شمس الدین ترک پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ آگئے تھے۔ اب وہ فیض بھی منجملہ نوادر ہے جو بعد وصال جاری ہوا کہتے ہیں کہ مزار پر برقِ جلال تڑپنے لگی جس کی وجہ سے کوئی قریب نہیں آسکتا تھا۔ مجاور بھی جان بچا کر دُور جا بے تھے۔ گویا یہ برقِ دور باش کا مظاہرہ یوں کرتی تھی کہ کسی کو جلال سے نقصان نہ پہنچے۔ لیکن شیر اور درندوں کو اجازت تھی کہ اپنی دُموں سے مزار پر جھاڑو دیا کریں۔ اتفاقاً اس برقِ جلال نے ایک سنیا سی کو مزار پر حاضری کی اجازت دے دی تھی۔ اس نے قبر کے اندر کا حال معلوم کرنے کے لیے مزار میں ایک سوراخ کیا اور اس کے اندر سر ڈال کر دیکھنا چاہا۔ مگر اس کا سر پھنس کر رہ گیا اور اس کا دم نکل گیا۔ رات کو خواب میں مجاوروں کو حکم دیا کہ اس کُتے کو نکال کر باہر پھینک دیں۔ چنانچہ تعمیل کی گئی اور مزار کی مرمت بھی کر دی۔ اب برقِ جلال اور شیروں کی نگرانی کو نا کافی سمجھ کر مجاوروں کو یہاں رہنے کے لیے بلا لیا گیا۔

مشہور ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ بے طرح جلالی تھے۔ ان کے جلال کے
نقشے مختلف آتشین رنگوں میں کھینچے گئے ہیں۔ ایسے کہ ان کے تصور سے کلیجہ منہ کو آجاتا ہے اور
دل دہل جاتے ہیں۔ ان کی جلالی داستانوں کے بیان کرنے والے معاندین نہیں بلکہ صاحبِ علم
فضل تذکرہ نگار ہیں۔ اقتباس الانوار کے مصنف قطبِ وقت مولانا اکرام اللہ شاہ براسوی نے
تحریر فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحبِ جلال تھے۔ ان ہی کے نقش قدم پر حضرت
مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔ اسی وجہ سے ان میں جلالی شان پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اصل
یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت قہر و جلال کی تھی۔ ان کی شبیہ مبارک سے رعب ٹپکتا تھا
مگر ان کی پوری زندگی عجز و صبر سے بھری ہوئی ہے۔ فرعون کی دشمنی اور قوم کی نافرمانیوں و
گناہوں پر انہوں نے جلال کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ قبطی و اسرائیلی میں بیچ بچاؤ کرتے ہوئے قبطی
کے تھپڑ مار دیا تھا اور اتفاق سے وہ مر گیا۔ اس پر انہیں بیحد ندامت ہوئی اور سزا سے بچنے
کے لیے مدائن چلے گئے۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ چلہ پورا کر کے جب توریت کے الواح کوہِ طور
سے لے کر آتے تو پوری قوم سامری کے بچھڑے کی پرستش کرنے لگی تھی۔ یہ صدمہ کی بات
ہی تھی اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام پر برس پڑے کہ تم نے قوم کو گمراہ کیسے ہونے
دیا اور کیوں نہیں ہدایت کی۔ لیکن ان سے حقیقت معلوم کرنے کے بعد غصہ جاتا رہا اور سامری
سے نہایت نرمی کے ساتھ اس کی شیطنت کی وجہ دریافت کی۔ یہ دونوں واقعات موسیٰ علیہ السلام
کے جلالی ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو عرصہ تک کھانا نہ کھانے
کی وجہ سے صایر کا خطاب عطا ہوا تھا۔ مگر جب کلیر آتے تو وہاں کی نافرمانیوں کی وجہ
سے ان کے جلال کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہل عقیدت براہِ کرم غور فرمائیں کہ صبر و جلال یکجا جمع ہو
سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں جمع ہو سکتے تو یہ کرامتیں جو جلالی لکھی گئی ہیں مخدوم پاک رحمۃ اللہ

علیہ کی توہین ہیں۔ کلیر میں اگر غضب نازل ہوا تو وہ منجانب اللہ تھا۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ
 علیہ کا اس جلال سے کوئی تعلق نہیں۔ اندر میں حالات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مخدوم پاک
 رحمۃ اللہ علیہ کو جلال متیصفت و متہم کرنے والے جلال کے معنی ہی نہیں سمجھے۔ جلال کے
 اقسام ہوتے ہیں۔ ایک جاہلانہ جلال ہوتا ہے اور ایک مہذب و باشعور ہوتا ہے۔ باشعور
 اور مہذب جلال میں محض رعب ہوتا ہے۔ غضب نہیں ہوا کرتا۔ جاہلانہ اور مہذب جلالوں
 کو سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے
 حالات اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ اسلام لانے سے پہلے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ
 نے اپنی بہن اور بہنوئی کی تلاوت قرآن پاک سن کر بری طرح خبر لی اور اسی غصہ میں صاحب
 قرآن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف کا رخ کیا۔ روتے انور کا جمال ملاحظہ کرتے ہی انکا جاہلانہ
 جلال مہذب جلال بن گیا۔ کلمہ پڑھتے ہی بنی اور ان کے مہذب جلال نے خانہ کعبہ میں اذان
 دلوائی اور علانیہ باجماعت نماز پڑھوائی۔ کفار دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ حضرت خالد
 رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرگزشت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ جنگ اُحد میں پیٹھ پھیر کر بھاگے ہوئے
 جا رہے تھے۔ گھاٹی کے پچھلے حصہ کو مسلمانوں سے خالی دیکھ کر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اس
 اچانک حملہ سے مسلمانوں کے ہوش جاتے رہے اور آقائے دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ
 وسلم کا دندان مبارک تک شہید ہو گیا مگر مدد الہی شامل حال تھی مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی
 اور حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سوائے ایمان لائیکے کوئی چارہ نہیں تھا۔ حضرت عمر فاروق
 رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اسلامی جلال اور عدل کا ڈنکا بجوا دیا۔ اور حضرت خالد رضی اللہ
 تعالیٰ عنہ نے اپنی جلالی شمشیر کی دھاک بٹھا دی۔ ظاہر ہے کہ جلالی فطرت اپنی جگہ رہی مگر جلال
 شایستہ بنا لیا گیا تھا۔ اسی باشعور جلال کا نام شجاعت ہے۔ اسی شجاعت کی وجہ سے ایک

امیر المؤمنین ہوتے اور دوسرے سید اللہ کہلاتے۔ ان دونوں کے کارناموں کو دنیا بھلا نہیں سکتی۔
 موسیٰ علیہ السلام اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے جلال کو قہر و غضب سمجھنے والے نہ جلال
 کو سمجھے اور نہ ان بزرگوں کے مراتبِ علیہ کو پہچان سکے۔ اصل یہ ہے کہ کیفیات جلال و جمال
 خداوندی عطیات ہیں۔ تنہا جلال جہالت و شیطنیت ہے اور تنہا جمال بتخر و ناز ہے۔ امتزاج سے
 دونوں رحمت بن جاتے ہیں۔ جلال بغیر جمال کے ہیچ ہے اور جمال جس میں جلال نہ ہو ایک کھیل
 ہے اسے سمجھنے کے لیے جمال و جلال الہی پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے جمال الہی سے حیرت و
 سراسیمگی پیدا ہوتی ہے اس کیفیت کو خوف و دہشت کا اثر نہیں سمجھا جاسکتا۔ حسن میں دلکشی کے
 ساتھ رعب ہوتا ہے اور عشق میں خوف کے ساتھ شوق شامل ہوتا ہے۔ نشتر فساد اگر خون
 نکالتا ہے تو زخم بھی اچھا کرتا ہے۔ قصاص میں جلال و جمال کا لزوم ہے جس آیت پاک
 میں شان قہار می کا اظہار ہے اس کے بعد ہی فوراً دوسری آیت شریف میں شان غفاری
 کریمی کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ جلال و جمال کا حسین ترین امتزاج قرآن عزیز میں ملتا ہے جس طرح
 موسیٰ قوم پر موسیٰ علیہ السلام نے نہیں بلکہ اللہ جل جلالہ نے عتاب فرمایا تھا اسی طرح
 کلیر میں بھی عتاب ہوا ہوگا۔ لیکن اس عتاب الہی کی جو کلیر میں ہوا تاریخ کو خبر نہیں۔ عقیدت
 جس کی بنیاد خوف پر ہو محبت سے واسطہ نہیں رکھ سکتی حیرت ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ
 علیہ کو غصہ۔ جلال۔ انتقامی جذبہ و نفسانیت سے منسوب کرنے میں تذکرہ نویسوں نے کتناخی
 کیوں محسوس نہیں کی اور معتقدین کو کیوں فریب میں مبتلا کیا۔ اگر ان کو روحانیت سے ذرا بھی حصہ
 ملا ہوتا تو انہیں اعلان کرنا چاہیے تھا کہ جس کو انہوں نے جلالِ صابری ظاہر کیا ہے وہ در
 حقیقت روح کی تھلی تھا۔ اسی تھلی سے وہ عقیدت مندوں کو مستفیض کیا کرتے تھے اور کہا
 کرتے ہیں۔ اگر مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فیض میں قہر شامل ہوتا تو سلسلہ کی ایسی

شاندار تبلیغ ممکن نہ ہوتی۔ اولیاء کی کرامتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی کرامتوں سے دل کو تقویت ہوتی ہے اور یہ کرامتیں حق کی طرف راہنمائی کیا کرتی ہیں۔ اب جو کرامتیں مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی بتائی جاتی ہیں ان سے عجز بیت پیدا ہوتی ہے اور عجز بیت گمراہی کی علامت ہے۔ عقیدت مند نسبت کی وجہ سے ہر رطب و یابس کو قبول کر لیتے ہیں اور ادب کی وجہ سے انکار نہیں کر سکتے۔ اسی لیے غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دشمنوں کو اعتراض و انکار کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ قطعی ناقابل قیاس ہے کہ کلیر کی مسجد اتنی طویل و عریض تھی جتنی ظاہر کی گئی ہے اور خدا جانے جمعہ کی نماز کے لیے پانچ سو پاکی سوار کہاں سے آجاتے تھے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ دموآن جیسے سرکش حاکم اور تبرک جیسے متمرّد قاضی سلطان ناصر الدین اور غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہوں۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ صاحبان ولایت کا دعویٰ کرتا تو درکنار اپنے آپ کو ظاہر بھی نہیں کیا کرتے جو بزرگ خلیفہ و مبلغ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں وہ اخلاق الہی سے متصف ہوتے ہیں اور اپنی روحانیت سے بغیر ذاتی نمائش کے ہدایت کیا کرتے ہیں۔ صاحبان ولایت رموز و اشارات سے کلام کرتے ہیں اور اپنے سر باطن کہیں افشاء نہیں ہونے دیتے اس کے علاوہ انبیاء و رسول تک کسی کو مجبور نہیں کر سکتے۔ ان کا فرض پیغام الہی کو پہنچا دینا ہے اور بس۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو جب مسجد کی صفت آخر میں دھکیل دیا تو کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قہر کا اظہار کیا۔ قرب و جوار کے باشندوں کو اس قہر کی خبر نہیں۔ حکومت کو بھی اس کا علم نہیں اور مؤرخین بھی اس کے متعلق خاموش ہیں۔ سلطان ناصر الدین محمود اپنے زوریں سال جلوس کے بعد بدایوں تشریف لاتے تھے پھر ڈاکوؤں کا استقبال کرنے کو وہ ہمالیہ کے دامن میں جو بجنور کے شمال میں ہے، گئے تھے۔ سلطان نے ہردوار کے قریب پایا پور کے مقام پر گنگا کو

عبور کیا تھا۔ اس دورے کی تاریخ ۱۲۵۲ھ ہے۔ شاہی افواج کلیر کے جنگل میں ڈاکوؤں کی تلاش میں گشت کر رہی تھیں۔ انہوں نے آگ دیکھی اور نہ جلنے کے آثار انہیں دکھائی دیئے لیکن اگر اس آگ کا ذکر بطور استعارہ ہے تو مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی روحانیت سے روشنی پھیلانی۔ کفر و ظلمت کو دور کیا اور انوار الہی سے دور دور اس نواح کو منور فرما دیا۔

وصال کے بعد فیض کی تفصیل عجیب و غریب ہے۔ یعنی مزار پر برق جلال ٹپنے لگی کسی کو قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ امام صاحب کے روضہ سے دوسرے پتھر لاکر حضرت شمس الدین ترک پانی پی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے مزار اس طرح بنایا تھا کہ ان پتھروں کے درمیان جد مبارک رکھ دیا تھا۔ پھر مٹی چڑھا کر قبر کی صورت بنا دی تھی یہ سنیا سی کی گتاشی کے بعد مجاوروں نے ۱۹۰۷ھ میں خام مزار کی مرمت کر دی تھی یہ عرصہ دراز کے بعد حضرت شیخ عبدالقدوسؒ نے ۱۹۳۳ھ میں مزار مبارک کو پختہ بنایا تھا۔ اسی موقع پر سیدنا شیخ عبدالقدوس نے برق جلال کو تنزیہ کے غلاف میں بند کر لینے کی درخواست کی تھی کشفی مذکرہ حقیقت گلزار صابری راوی ہے کہ پختہ مزار ۱۹۰۷ھ میں بنوایا گیا تھا۔ مزار کے پختہ ہو جانے کے بعد برق جلال خاموش ہو گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جبکو برق جلال سمجھا گیا وہ روح مقدس کی تجلی تھی جو آج بھی رات کے وقت چشم بیتا کو نظر آجاتی ہے کشف و کرامات اگر صحیح بھی ہوں تو بھی وہ کمالات صوری ہیں اور شرط ولایت نہیں ہیں جن اولیاء

۱۔ طبقاتِ ناصری ۱۲۵۲ھ میں حضرت جمال ہانصوری رحمۃ اللہ علیہ بھی حیات تھے۔

۲۔ گلزار حقیقت صابری حدیقۃ الاولیاء مرتبہ غلام سرور لاہوری۔

۳۔ ماخوذ از سہ ماہی رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۶۷ء کراچی۔

۴۔ بروایت سیرالاقطاب پختہ قبر بادشاہ جہانگیر نے بنوائی تھی اور روضہ سکندر لودھی نے تعمیر کروایا تھا۔

پر ارتفاع تعین جسمانی کی وجہ سے مردے کا لفظ عائد ہو گیا ہے ان کے مزارات پر زائر بغیر کیفیات موت طاری کئے ہوئے ان کا ہم جلس نہیں ہو سکتا اور نہ ان سے ملاقات کر سکتا ہے۔ ظاہری موت طاری کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ یا محویت یا خواب۔ اس طرح کی موت طاری کر لینے کے بعد جو استفادہ ہوتا ہے۔ اسے فیض خاص کہتے ہیں۔ اور اسی عالم و کیفیت میں ملاقات و گفتگو بھی ہو جاتی ہے۔ فیض عام یہ ہے کہ مزارات اولیاء پر حاضر ہونے والوں کو صاحب مزار اپنا مہمان سمجھا کرتے ہیں اور مہمان کی سی خاطر و تواضع کرتے ہیں۔ اس فیض عام کا احساس اکثر حاضر ہونے والوں کو ہو جاتا ہے مگر شبہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس قسم کا مشابہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی ہوا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے باری تعالیٰ کی تجلی کو پہلے آگ سمجھا تھا۔ اور اپنی اہلیہ سے کہا تھا کہ آگ لے آؤں۔ جب وادعیٰ ایمن میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ جس کو انہوں نے آگ خیال کیا تھا۔ وہ باری تعالیٰ کی تجلی تھی۔ اسی قسم کی تجلی اکثر مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر دکھائی دیتی ہے جس کو نا فہم برقی جلال سے موسوم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا مغالطہ فقدان معرفت کی وجہ سے پیدا ہوا اور اس کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں گھڑ لی گئیں۔ اس تشریح کے بعد اگر فیوض و کرامات کی حقیقت سمجھ لی گئی تو ایسی واپسی میں ناقابل اعتماد ہوں گی۔

حیرت ہے کہ کسی نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیم و تلقین کی وضاحت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ان کا کوئی ارشاد درج کیا۔ بزرگوں اور ولیوں کی عظمت و جلالت شان ان کے تقویٰ اور خشیت سے سمجھی جاتی ہے۔ ان تذکروں میں ایک روایت بہ لحاظ معنی دلچسپ و لطیف ہے مگر اس کی واقعاتی صورت کچھ نہیں ہے کہتے ہیں کہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قوال سیر کونیکلے دہلی میں سلطان المشائخ

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شاندار خاطر و تواضع فرمائی اور انعام و اکرام سے نوازا اس کے یہ قوال کلیئر پہنچے تو وہاں عالم ہو تھا۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بآمدتے اور قوال اور حضرت شیخ کی خیریت دریافت کرنے کے بعد یہ فرمایا گولڑوں میں نمک ڈال دیا اور وہ گولڑہی نذر بھی کیے۔ اتنی ملاقات کر کے حجرہ میں چلے گئے۔ قوالوں نے اجماعاً پہنچ کر دونوں صاحبان کی تواضع کا حال بیان کیا یہ سن کر کہ مخدوم نے میری خیریت دریافت کی تو وجد آگیا اور فرمایا جب صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مجھے شیخ کہہ دیا تو اب میں واقعہ شیخ ہو گیا۔ درپردہ شکایت کرنے کے بعد قوالوں نے صابری گولڑہا صاحب رحمۃ اللہ کی خدمت میں ڈال دیئے۔ وہ حاضرین میں تقسیم کر دیئے گئے۔ جس نے کھائے وہ ولی ہو گیا بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے قوالوں کو دونوں صاحبان کی تواضع کی حقیقت سمجھائی کہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ عاشق الہی ہے اور سید نظام الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ محبوب الہی ہیں لہذا دونوں نے اپنی خصوصیت کے ساتھ پوری تواضع کی۔ یہ روایت واقعیت سے بعید ہے اس زمانہ میں حضرت سلطان المشائخ زلزال شدید میں مبتلا تھے اور خود لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ایک دمڑی کے کئی سیر خر بوزے بکتے تھے مگر میں اپنی عمرت کی وجہ سے خرید نہ سکا۔ اس روایت کو اگر زلزال شدید کے بعد کا قصہ سمجھا جائے تو مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو چکا تھا۔ سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو زلزال شدید سے نجات ۶۸۵ھ میں ملی تھی اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی صحیح تاریخ ۶۸۹ھ ہے

ان واہی روایتوں کو خارج کر دینے کے بعد ان تذکروں کے صفحے کو رے اور سپاٹ رہ جاتے ہیں۔ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں ہے مگر عقل سے پہچانا ہے معرفت کے دو ہی طریقے ہیں۔ نفی و اثبات ابراہیم علیہ السلام نے چاند تاروں اور سورج کی نفی کرتے کرتے

خداے لایزال کو پایا۔ نفی اگر حق کی کی جائے تو حق پر آنچ نہیں آتی اور نفی خود شرمندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ حق کا ظن و گمان سے کوئی تعلق نہیں۔ ظنیات سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ فلسفہ الجہایا کرتا ہے۔ اس کا تعلق خیالی دنیا سے ہے۔ عملی زندگی فلسفہ سے نہیں بنا کرتی۔ ظن و تخمین سے روح مردہ ہو جاتی ہے۔ حضرت نبی الہی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خدا تک پہنچانے کا اثبات کا طریقہ سکھایا ہے قرآن عزیز کے معنی سمجھائے۔ خود عمل کر کے قرآنی تعلیم کو واضح کیا۔ اُسوہ حسنہ کی پیروی سے قلب و زبان میں تعاون ہو جاتا ہے۔ مغایرات دور ہو جانے کے بعد مشاہدات کے ذریعہ وحدہ لا شریک جل جلالہ کی بارگاہ تک رسائی ہو جاتی ہے۔ اخلاق الہی مل جاتے ہیں اور یقین کامل ہو جاتا ہے مختصر یہ کہ حق باطل کش ہے اور کسی طرح باطل کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے باطل کی نفی کر کے خداے لایزال کو پایا اور روحی فداہ حضرت رسول عربی صلوٰۃ اللہ علیہ اثبات کے ذریعہ قاب تو سین تک تشریف لے گئے اور معراج حاصل کی تو حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سمجھ لینا تو کوئی مشکل ہی نہیں۔ اصل نفی یہی ہے کہ اثبات مد نظر ہے لا کی مشق میں اگر اللہ کو ضبط کر دیا گیا تو ایسی نفی مذموم اور کفر ہے۔ اگر توہمات کا حجاب نہ ہو تو ولی کی روحانیت خود اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ ولی چونکہ اخلاق محمدی سے آراستہ ہوتا ہے تو باوجود جلالی فطرت رکھنے کے تعلیم نبوی سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتا۔ لوگوں نے اپنے ذاتی وہم و خوف کی وجہ سے کیوں سمجھ لیا کہ مخدوم پاک نے دلوں میں خوف ڈال دیا تھا۔ ولی کا فرض اور کام یہ ہے کہ اس قسم کے پردوں اور موانعات کو دور کرے لیکن لوگ خود بینی و خود رانی کی وجہ سے قائدہ اٹھانے سے محروم رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مخدوم پاک کی تعلیم و تبلیغ میں کوئی ظاہری پہلو نہیں تھا۔ ان کی تسخیر

باطنی تھی۔ اپنی طرز و سوک سے نامعلوم طور پر قلوب میں صحیح جذبہ پیدا کر دیتے تھے۔ ظاہری حیات میں جو کرامات ان سے صادر ہوتیں وہ مُرورِ زمانہ کے سبب یاد سے محو ہو گئیں یا ان میں تبدیلی کر دی گئی۔ اب یہ بے معنی و بے تاثیر روایتیں جو حضرت کے وصال سے تقریباً چار سو سال بعد لکھی گئی ہیں ان کو نظر انداز کر کے ان کے عام درویشوں جیسا ہی تصور جمایا جائے تو بھی ان کی عظمت نمایاں ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھا جائے کہ وہ معمولی فقیروں کی طرح کلیر میں داخل ہوتے نہ انہوں نے اپنا تعارف کروایا اور نہ کسی نے ان کی بات پوچھی وہ ایک جگہ چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ آخر کار ان کی بے نیازی و خستہ حالی پر خستہ حالوں نے ہی ترس کھایا۔ جس جگہ کھڑے تھے وہاں ایک بوڑھی عورت گلزاری کا جھونپڑا تھا وہ اور اس کے ہمسایہ مفلوک الحال تھے۔ سب کے کہنے سننے سے گلزاری کے یہاں قیام پر راضی ہو گئے مگر زیادہ وقت قریب کے گولڑے کے درخت کے نیچے گزارتا تھا۔ ان کے مرشد اعظم حضرت شیخ کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی اجودھن میں کریل کے درختوں کے نیچے قیام پذیر ہوئے تھے۔ اور ان درختوں کی چھال اور پتے ابال کا نوش جان فرمایا کرتے تھے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر اکثر استغراقی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ان کا بولنا چالنا نہ بولنے چالنے کے برابر تھا۔ جسم کے لیے لباس۔ خوراک اور آزار لازمی ہیں۔ ان کی خوراک بے نمک کے ابلے ہوئے گولڑے تھے۔ قلتِ طعام۔ قلتِ منام اور قلتِ صحبتِ انام ان کی خصوصیات تھیں۔ لباس میں کڑتے۔ تہمد اور عملے کے علاوہ ایک رومال بھی تھا جو زریبِ گلورہ ہوتا تھا۔ کپڑے جب میلے ہو جاتے تو دھویے جاتے جب پھٹ جاتے تو کوئی نہ کوئی نذر کر دیتا۔ بیماری کو

۱۔ گلزاری کا جھونپڑا وہاں تھا جہاں اب حضرت کا مزار ہے۔ مسجد امام صاحب کے مزار کے قرب و جوار میں تھی۔ وہیں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔

نہوں نے مرض نہیں سمجھا۔ درد دکھ کی وجہ سے ان معمولات میں کبھی فرق نہیں آیا۔ موسم کے انقلابات کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ مر سجاں و مر سچ تھے۔ دیکھنے والوں کی سمجھ میں ان کے واردات ہیں آتے تھے۔ ان کے حالات و معمولات بذاتِ خود کرامات تھے۔

اس ناخواندہ و اجنبی مہمان کے قریب بیٹھ کر لوگ آپس میں چیمکوتیاں کیا کرتے تھے۔ بس ان کا وقت آسانی سے کٹ جاتا تھا۔ ہر شخص انہیں اپنا سمجھتا تھا مگر وہ سب سے بے نیاز تھے۔ ان کی خاموشی میں کشش تھی۔ ان کی بے بوٹی و بے نفسی کا ہر شخص معترف تھا۔ کسی انہیں منستے نہیں دیکھا۔ اور نہ انہیں کسی بات پر کبھی غصہ آیا۔ ان کی محویت میں ذیومی حوادث کبھی رخنہ اندازہ نہیں ہوتے۔ وہ نماز پڑھتے تھے اور ان سے سب کو دلچسپی تھی مگر ان کی خوببو کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگی۔ عام افواہ تھی کہ وہ بولتے نہیں ہیں مگر جب کبھی بولتے تو ایک ہی فقرے میں اکثر حاضرین کے دلی سوالوں کا جواب دے دیتے تھے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ ایک ہی وقت میں قریب بعید کے مختلف مقامات پر لوگوں نے انہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے ہر کام کرامت ہی کے ذریعہ کیا مگر اظہار و دعویٰ نہیں کیا۔ اگر کوئی کرامت کا ذکر بھی کرتا تو اس طرح ٹال جاتے کہ گویا ان سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ دنیا کی رونق نہیں تھے لیکن دنیا کی رونق ان سے ہی تھی۔ وہ تارک الدنیا تھے مگر دنیا کی اصلاح ان کی فطرت و فرائض میں داخل تھی مسلمانوں نے انہیں مست مولا سمجھا۔ ہمنو نے ”پریم ہنس“ خیال کیا۔ امیروں سے وہ نہیں ملے۔ لوگوں نے دیوانہ سمجھا مگر انہوں نے پروا نہیں کی۔ دنیا انہیں سمجھی یا نہیں سمجھی مگر وہ اپنا کام کر گئے۔

ظاہری تذکروں میں کوئی ذکر نہیں ہے مگر کشفی تذکروں میں ان کے دو تین ارشاد مذکور ہیں۔ نماز کے لیے جب ہوشیار کیے جاتے تو فرماتے ”شریعت بھی کیا چیز ہے جو حضوری سے دربار میں لے آتی ہے“ نماز کے لیے طہارت و ستر پوشی ضروری ہے۔

وہ ان شرائط کو ملحوظ رکھتے تھے۔ کپڑے گل ارمنی سے رنگتے تھے۔ اس مختصر ارشاد سے خلوت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ ثابت ہوا کہ شکر و صحو و دو نون حالتوں میں شریعت کا پاس تھے۔ جب غذا پیش کی جاتی تو کہتے کہ بندہ کھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کھانے سے بے نیاز بندگی اور الوہیت کی اس سادہ تعریف پر ہزاروں فلسفے قربان کئے جاسکتے ہیں۔ جب فنا میں کریم کا رسانہ بقا مرحمت فرمادیتا ہے تو صوفی اس مرتبہ کو "جمع الجمع" سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی کا دوسرا نام "وحدت الوجود" ہے۔ اسی کو نقشبندی حضرات "قیومیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بندے کی ترقی کا یہ آخری مقام ہے۔ بندہ مولا صفات بنا دیا جاتا ہے مگر ذات واجب الوجود ہر معیار و قیاس سے اعلیٰ و بالا ہے۔ لا الہ الا اللہ پر ایمان رکھنے والے اور حضور رحمتہ للعالمین صلوٰۃ علیہ وآلہ وسلم کو عبد اور رسول سمجھنے والے وہم و خیال میں بھی تصور نہیں کر سکتے کہ بندہ خدا بن جاتا ہے۔ مولا صفات بن جانے پر جو اختیارات حاصل ہوتے ہیں وہ ذاتی نہیں ہوتے بلکہ عطائی ہوتے ہیں۔ اللہ ذو الفضل العظیم۔

مخدوم پاک کا مندرجہ بالا تعارف قیاس معتبر کی حیثیت رکھتا ہے مگر پھر بھی قیاس ہے۔ لہذا ان جیسی بزرگ و عالی ہم ہستی کی صحیح تعریف ان کے کارناموں سے سمجھی جائے تو بہتر ہے۔ ان کے کارنامے چونکہ بامعنی تھے لہذا سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ سب جانتے ہیں کہ انہیں خلافت و ولایت کے دو منصب حاصل تھے۔ خلافت سلسلے کی تنظیم و تبلیغ کے لیے عطا کی جاتی ہے اور ولایت کا منشاء روحانی انتظامات سے ہے۔ دسار خلافت اعلانیہ کیا جاتا ہے اور معاملات و ولایت باطنی ہوتے ہیں۔ مخدوم پاک رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کی تبلیغ و اشاعت ابتدا میں مخفی رہی بعد میں حریم نور سے نکل کر سلسلہ کی اشاعت نور علی نور ہوئی۔ سلسلہ کا چیلنا ان کی بہترین کرامت ہے۔ انہیں مجذوب ساک کے درجہ میں خلافت

عطا کی گئی تھی۔ مجذوب سالک نیمے دروں نیمے بروں ہوتے ہیں ان کی کارگزاریاں سالک کامل کی طرح اعلانیہ نہیں ہوتیں۔ لہذا مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تبلیغ خاص قسم کی ہے انہوں نے جماعت خانہ بنایا۔ نہ لنگر جاری کیا۔ نہ درس و تدریس کی مجلس قائم کی اور نہ کسی طرح سے اشتہار دیا۔ وہ گمنام ہی رہتے مگر کار خلافت کی وجہ سے ظاہر ہونا پڑا۔ ولایت کے کارناموں کا اعلان نہیں ہوا کرتا۔ اور کسی نوعیت سے ولایت کا اظہار و دعویٰ بھی نہیں کیا جاتا مگر باوجود بے ہمہ دیا ہمہ ہونے کے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اخلاق و طرز میں نامعلوم روحانی تسخیر و کشش تھی اور ہے۔

کمالات ہیں کہ حضرت مخدوم قدس سرہ العزیز کے قیام کلیر کی مدت اور سال وصال کا تعین نہ کیا جاسکا۔ واقعہ ہے کہ ۱۲۶۶ھ میں ولایت حاصل کر کے کلیر تشریف فرما ہوئے تھے۔ اب اگر کسی طرح تاریخ وصال کا تعین ہو سکے تو قیام کی مدت بھی معلوم ہو سکتی ہے بادی النظر میں قیام کی مدت حضرت ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے واقعات سے طے کی جاسکتی ہے۔ ملفوظات کے مطابق حضرت ترک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بعد بیعت کلیر سے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں اجودھن چلے گئے تھے۔ پھر بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے بعد کلیر آئے تھے۔ اور آخر تک یہیں رہے۔ اس مرتبہ حضرت ترک رحمۃ اللہ علیہ یہاں آکر اٹھارہ سال رہے تھے۔ روایت ہے کہ حضرت مخدوم علیہ الرحمۃ نے دکن کے جہاد میں شریک ہونے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ”جس روز تمہاری دعا سے دکن کا قلعہ فتح ہوگا اسی روز دنیا سے ہمارا کوچ ہوگا۔ تم فی الفور یہاں آکر ہماری تجہیز و تدفین کرنا اس کے بعد تیسرے روز پانی پت چلے جانا“ تاریخ نہیں بتاتی کہ دکن کا کونسا قلعہ حضرت ترک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دعا سے فتح ہوا تھا۔ تاریخ کا مصدقہ بیان ہے کہ ۱۲۶۴ھ میں تخت

نشین ہو کر سلطان غیاث الدین بلبن نے دکن کی جانب کبھی کوئی حملہ نہیں کیا۔ بلبن کا انتقال
۶۸۶ھ میں ہوا تھا۔ معلوم نہیں تذکرہ نویسوں نے اس نامعلوم دکنی قلعہ کے فتح کرنے کا سہرا
بلبن کے سر کیسے باندھ دیا۔ بہ حیثیت سپہ سالار ہونے کے جلال الدین خلجی نے قلعہ بھنبور کو
محاصرہ کیا تھا اور بغیر تسخیر کیے ہوئے ۶۸۹ھ میں واپس چلا آیا تھا۔ اس کے بعد جب جلال الدین
سلطان بن گیا تو دکن میں اس نے متعدد کامیاب حملے کئے۔ کشفی تذکرہ کا الہام ہے کہ آئیر
کا قلعہ جلال الدین خلجی کے عہد میں اس کے سپہ سالار علامہ الدین خلجی نے ۶۸۹ھ میں فتح
کیا تھا۔ اس کے سال بھر بعد مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ۶۹۰ھ میں ہوا، امیر کے
قلعہ کی تسخیر کے متعلق اس کشفی تذکرہ "حقیقت گلزار صابری" نے تاریخ فیروز شاہی کی سند
لکھی ہے اور وہ اس طرح کہ حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جلال الدین کی
درخواست پر فرمایا تھا کہ دکن کے لشکر میں ترک پاتی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ موجود ہیں۔ ان کی
دعا سے قلعہ آئیر فتح ہوگا۔ لہذا ان سے رجوع کی جائے۔ اب تاریخ فیروز شاہی کا بیان
بھی قابل ملاحظہ ہے۔ لکھا ہے کہ جلال الدین خلجی نے کسی مہم کے بارے میں حضرت سلطان المشائخ
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کبھی کوئی درخواست نہیں کی۔ البتہ علامہ الدین خلجی اپنی مشکلات
کے متعلق حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دعا کی درخواست کیا کرتا تھا چنانچہ
جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنی کتاب "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" میں لکھا ہے
"حالانکہ سیاسی و روحانی بادشاہوں کا قرآن السعدین نہ ہو سکا لیکن... علامہ الدین خلجی مشکلات
کے وقت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں کا طالب رہا۔ جب وارنگل کی طرف بھجے ہوئے لشکر
کی اطلاع کافی دنوں تک نہیں ملی تو سلطان علامہ الدین خلجی نے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی
طرف رجوع کیا... شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سلطان کا پیغام سن کر فرمایا کہ یہ فتح

کیا حقیقت رکھتی ہے۔ ہم تو اس سے بھی بڑی فتوحات کی اُمید رکھتے ہیں، یہ مختصر جواب بلا غت و کرامت کی جان ہے۔ ثابت ہوا کہ کشفی تذکرہ نے از روئے کشف تاریخ فیروز شاہی کا جو حوالہ دیا ہے وہ از سر تا پا غلط ہے۔ بعض تذکروں میں قلعہ آمیر کے بجائے وارنگل کی فتح کا ذکر ہے لیکن وارنگل کی فتح ۱۶۹۰ء میں ہوئی ہے۔ حال کے ایک تذکرے نے اپنی تحقیق کے مطابق لکھا ہے کہ اس سال یہ عہدِ بلبن قلعہ چتوڑ فتح ہوا تھا۔ مگر یہ بھی غلط ہے اس لیے کہ قلعہ چتوڑ علامہ الدین خلجی نے ۱۶۹۰ء میں فتح کیا تھا۔ ایک اور ماہر تاریخ رقمطراز ہیں کہ اسی سال ۱۶۹۰ء میں جلال الدین خلجی نے قلعہ آمیر فتح کیا تھا۔ معلوم نہیں ان صاحب نے کس تاریخ سے یہ لکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سوانح نگار نے اپنے اپنے قیاس سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے مادہائے تاریخ نظم کئے ہیں مگر یہ سب افکارِ با بعد ہیں اور افواہوں پر مبنی ہیں۔ خزینۃ الاصفیا اور مدارج الولاہیت میں مادہ تاریخ "مخدوم" درج ہے اس سے ۱۶۹۰ء کا سال نکلتا ہے۔ مگر یہ بھی قیاسی ہے۔ شجرہ چشتیہ میں جو تاریخ لکھی ہے اس کی تصدیق و تطبیق تاریخی واقعات سے ہو جاتی ہے اور وہ سال ۱۶۶۹ء ہے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال بلبن کے عہد میں ہوا تھا۔ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کی تاریخ سے مخدوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال ۱۶۶۹ء کی تائید ہو جاتی ہے۔ بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کا صحیح سال بروایت حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۱۶۶۱ء ہے۔ اس کے بعد حضرت ترک کلیر میں اٹھارہ برس رہے ہیں اور یہ اٹھارہ برس کی مدت ۱۶۶۹ء میں پوری ہوتی ہے۔ جب سال وصال ۱۶۶۹ء مسلم ہے تو صاف ظاہر ہے کہ مخدوم رحمۃ اللہ علیہ نے کلیر میں تینتیس سال خلافت و ولایت کے فرائض حسن و خوبی سے ادا کئے۔

صحیح حالات معلوم کرنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں لیکن مخدوم پاک رحمۃ اللہ
 تعالیٰ علیہ کی شہرت و مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا سلسلہ دھوم دھام سے
 چل رہا ہے۔ ان کی تعلیم میں تاثر ہے۔ ان کی یاد بھلائی نہیں جاسکتی وہ زندہ ہیں۔ ان جیسے
 مجذوب سالک کے لیے کلیر کی ویرانی ہی مناسب و موزوں تھی۔ خدا جانے کہاں تک صحیح
 ہے کہ دنیوی معاملات روحانی انتظامات کے تحت ہوا کرتے ہیں۔ یعنی عالم بالا کے احکامات و
 انتظامات کی نقل عالم اسباب اور مادی دنیا میں کی جاتی ہے۔ عبد اللہ بن علی الحکیم ترمذی
 (بانی سلسلہ حکیمیہ) کا تصور مندرجہ آیات پر مبنی ہے کہ کل دنیا اللہ کے ولیوں میں تقسیم ہے
 ہر علاقہ کسی نہ کسی ولی کے تحت میں ہوتا ہے۔ اس اصول کے مطابق مخدوم پاک رحمۃ اللہ
 علیہ کی ولایت کلیر کی مدت ۶۲۶ھ سے ۶۶۹ھ تک ہے۔ اس مدت کی تطبیق سلطان
 ناصر الدین محمود (۶۶۴-۶۷۲ھ) اور سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۵-۶۹۲ھ) کے عہدوں میں ہوتی
 ہے۔ ان دونوں سلاطین کے طرز حکومت سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے
 روحانی انتظام کی ٹوہ لگائی جاسکتی ہے۔ ناصر الدین محمود رحیم و کریم و عادل اور دیندار تھا۔
 اور بلبن نے بحیثیت وزیر و سلطان اپنے جلال و جمال سے ایسا امن قائم کیا تھا کہ جس کی
 نظیر نہیں ملتی۔ ان دونوں سلاطین کے کارنامے روحانی انتظام کے چربے ہیں۔ اس طرح
 اسی سے مخدوم پاک کی کارفرمائی اور فراست کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر یہ اصول صحیح
 ہے تو تذکار نگاروں کی تراش خراش مہمل ٹھہرتی ہے۔ اس تطبیق سے صاحب کلیر
 کی تصویر آنکھوں میں آجاتی ہے۔ حضرت کے حالات بھی عجیب و غریب ہیں۔ انہیں
 لے سورہ ص آیت نمبر ۶۹۔ اس کی تفصیل اسی سورہ کی آیات نمبر ۸۶ تا ۸۷ میں ملاحظہ کر لی جائے۔ مطلب یہ ہے
 کہ ملار اعلیٰ میں دنیوی معاملات طے کیے جاتے ہیں۔

ہری علوم کی تعلیم دی گئی تھی۔ ان کے مجاہدات بھی مُسلم ہیں۔ ان کی خلافت علی الرغم عدو
 بت ہے۔ ان کی ولایت کی عام شہرت ہے اور درجہ مقبولیت رکھتی ہے۔ نزاع ہاسی
 کایت جو غلط العام ہونے کی وجہ سے معتقدین کی زبان پر ہے۔ اس کا ثمہ بھر بھی وجود نہیں۔
 یہ ہے کہ معتقدین ان بے سرو پا روایت پر نہ صرف عقیدہ رکھتے ہیں بلکہ ان کے صحیح ہونے
 صرا کرتے ہیں۔ مگر بایں ہمہ مخدوم پاک کی تعلیم مردہ دلوں کو حیات بخشی ہے اور زندہ کر دیتی ہے۔
 دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقشِ پا
 موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

خُلاصہ

- ① بعد حصولِ خلافت عمر ۳۳ سال ۶۲۶ھ میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
 کلیر کو روانہ ہوتے۔
- ② کلیر کی آبادی میں ہسنود کی کثرت تھی اور مسلمان قلت میں تھے۔
- ③ کلیر کی مسجد میں خلاف شرع سونے چاندی کے ظروف نہیں ہو سکتے تھے۔
- ④ یہاں کے حاکم وقاضی وہ نہیں تھے جن کے نام لکھے گئے ہیں۔
- ⑤ صاحبانِ ولایت دعویٰ و نمائش نہیں کیا کرتے۔
- ⑥ مخدوم پاک ایک ہی سانس میں صفت صبر اور صفت جلال سے متصف نہیں
 کئے جاسکتے۔ کیونکہ صبر و جلال کا یکجا جمع ہونا محال ہے۔
- ⑦ مسجد کا ڈھانا اور کلیر میں آگ لگا دینا خواب پریشان ہے۔
- ⑧ باطل پرست روح کی تجلی کو اپنی حماقت سے حلال سمجھے۔

- ⑨ حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں ظاہری ملاقات نہیں ہوئی۔
- ⑩ ناصر الدین محمود اور بلین کا طرز حکومت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے روحا انتظام کا چہرہ بہ ہے۔
- ⑪ خلافت و ولایت کے شعبے جدا جدا ہیں۔ کار خلافت علانیہ ہوتا ہے۔ اور انتظام ولایت باطنی و مخفی ہوتا ہے۔
- ⑫ حضرت ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا بلین کی فوج میں شامل ہونا اور ان کی دعا سے دکن کے کسی قلعہ کا فتح ہو جانا محض افسانہ ہے۔
- ⑬ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی عمر ۶۶ سال کی ہوئی۔
- ⑭ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال عہد بلین میں بسال ۶۴۹ھ ہونا صحیح اور معتبر ہے۔



تذکرہ حبیب صابری

جو میکدے سے اُڑے اُس خبر کو کیا کہیے

صوفیوں میں شیخ کے ارشادات محفوظ کر لینے کا دستور ہے۔ ان ارشادات کے مجموعہ کو ملفوظات کہتے ہیں اور شیخ کے حالات و سوانح جو لکھے جاتے ہیں وہ تذکرے کہلاتے ہیں۔ درویشوں کے سوانح ان کے واردات کیفیات و احوال پر مبنی ہوتے ہیں لہذا ان کو سمجھ لینا آسان نہیں۔ ان کے حالات بر بناتے عقیدت لکھے جاتے ہیں اس لیے مفہوم و تناسب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ لہذا تاریخی لحاظ سے ان تذکروں کو مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔ مشہور ہے کہ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہ العزیز کے بیٹا خلیفہ تھے۔ ان میں مخدوم علاء الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت نمایاں اور عظیم ہے۔ ان کے متعلق جتنے بھی تذکرے معتقدین نے لکھے ہیں وہ کچھ عجیب سے ہیں ان کے کارناموں میں محض کرامات ہی کرامات ہیں اور کرامات بھی عجوبیت سے بھری ہوئی ہیں اور عقل و آئین سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں ان کے ابتدائی حالات پر وہ خفا میں ہیں اور بعد ازلے پستی بنا دیتے گئے ہیں۔ متداول تذکرے صحیح تعارف کرانے سے معذور ہی نہیں بلکہ کلیتہً ناکام ہیں۔ وجہ یہ کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے استغراق کی وجہ سے ظاہری اسباب کی طرف التفات نہیں تھا اور ان کے اصحاب وہاں نثار خود بھی مستغرق رہے ہیں

صابریوں کے پردہ حفا میں رہنے کے زمانہ میں عجائبات پرستی کا دور دورہ تھا۔ معقولات کا رواج ہو گیا تھا اور عقائد کی صورت بگڑ گئی تھی۔ پھر ہوا یہ کہ نظامیوں اور سہروردیوں میں چل گئی۔ جب نظامی اپنے سلسلہ کی اشاعت کے لیے مختلف سمتوں میں چلے گئے تو بظاہر شمالی ہند تعلیم حشتیہ سے محروم سا ہو کر رہ گیا۔ اس نعیابت الجب کی حالت اور زمانہ میں حضرت شیخ العالم احمد عیدالحق ردو لوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح اپنے جمال و جلال کو ظاہر کیا۔ اگرچہ وہ بھی مجذوب ساک تھے مگر صابری تعلیم کی انہوں نے علانیہ اشاعت فرمائی۔ ردو لوی میں خانقاہ بنائی اور لنگر بھی جاری کیا۔ مگر چند دن کے بعد ان ظاہری طریقوں سے دست بردار ہو گئے۔ بقول شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مجذوب ساک کی توجہ، ساک کامل سے زیادہ قوی اور زود اثر ہوتی ہے۔ لہذا صابری تعلیم شیخ العالم کی کوششوں سے ظاہری طور پر بھی خوب پھلی پھولی۔ اس غیر معمولی اور اچانک تجدید نے معاصرین کو حیران کر دیا۔ آتش حسد بھڑک اٹھی۔ مخالفت کی ایک ہی صورت تھی کہ مغالطے پیدا کئے جائیں۔ نئی روایتیں تراشی جائیں اور خوب بدنامی رسوائی کی جائے۔ سیاسی و اقتصادی انتشار و انحطاط کی وجہ سے عقائد میں بھی خلل پڑ جایا کرتا ہے۔ لہذا اس عہد کے صوفیوں نے بھی رنگ بدلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رنگوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی اہانت و مذمت کرنے لگے۔ صابریوں نے معتز ضیہ کی لغویات کا جواب ضرور دیا لیکن وہ از قسم منطوق تھا۔ تاریخ مشائخ چشت کے فاضل مصنف جناب خلیق احمد نظامی صاحب نے بجا طور پر اشارہ کیا ہے کہ ان کے (یعنی مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے) حالات سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے مذہبی تذکروں میں تفصیل سے درج ہیں مگر ماخذ ندارد ہے ان کی بنیاد کشف پر ہے یا سنی سنائی روایات پر ہے۔ دونوں صورتوں

س اعتماد کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، واقعات کے علاوہ جو تاریخ فنانوں سے بنائی
 تھی ہے تو درایت کے ذریعہ اس کی چھان بین اچھی طرح کر لی جاتی ہے مگر صابری تذکرہ
 کاروں نے آنکھیں بند کر کے ہر رطب و یابس کو قبول کر لیا۔ پھر ان فضول روایتوں میں
 راہ مشنخت خوب گل و بوٹے بھی لگاتے۔ ان صاحبان کی تمام تر توجہ نسب و وطن اور کرامات
 رہی ہے۔ حالانکہ روحانیت میں ان امور کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ پھر بھی
 سب وطن کے متعلق فیصلہ نہ کر پاتے۔ انہوں نے کرامات کو طلسمات کا ہم پلہ بنا دیا ہے جب
 باحث نے طوالت اختیار کی تو معاندین کا منہ بند کرنے کے لیے قہر و غضب کی کہانیاں
 بنا کر لیں اور نہ سمجھے کہ یہ خیالی و جلالی داستانیں شریعت و طریقت کے خلاف ہونے
 وجہ سے اور بھی رسوائی کا باعث ہونگی طوفان نوح - فرعون کی غرقابی اور قہر الہی کے
 یہ واقعات بیشک صحیح ہیں۔ لیکن ان مواقع پر اللہ تعالیٰ نے قہر و جلال کا اظہار اس وقت
 کیا جب کہ اصلاح کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ ان تذکرہ نویسوں نے جس جلال کی نمائش
 ہے وہ مجرد جلال ہے۔ اس میں اتمام حجت کا کوئی ثابہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی
 س بندیوں کو بصورت معتقدات پیش کر کے جن کرامات کا اندراج کیا ہے اس کی اصلیت و
 غایت سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جن صاحبان کو نفسیات کا علم ہے وہ دیکھتے ہی سمجھ لیں گے
 کہ ان میں صداقت کتنی ہے اور راولیوں کے قیاسات کا کتنا حصہ ہے جو انانیت و باطل پرستی
 کی وجہ سے ہے۔ سب سے زیادہ پریشان کن اور حیرت انگیز یہ حقیقت ہے کہ مخدوم پاک
 رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق نہ صرف معاصر تاریخ خاموش ہے بلکہ ابتدائی چشتی تذکرے
 بھی انگشت بندہاں ہیں معاندین اسی سبب سے خیال کرتے ہیں کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ
 تعالیٰ علیہ کا وجود ہی نہیں تھا۔ مگر دیگر سلاسل کے بزرگوں نے ان کا ذکر خیر ادب و تعظیم سے

کیا ہے ان بزرگوں کے مختصر بیانات حضرت کے وجود اور ان کی مقبولیت کا بہترین ثبوت ہیں۔ شاہ ابو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ ان کے ہم عصر تھے۔ بعد والوں میں حضرت بہا الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں ان سب نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اعتراف کیا ہے۔ حضرت خواجہ معصوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب "سبع الاسرار فی مدارج الاخیار" میں لکھا ہے: "واضح ہو کہ حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دو سلسلے ہیں۔ جو بواسطہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہے اس کو نظامیہ کہتے ہیں اور جو بواسطہ علی احمد صابری قدس سرہ ہے اسے صابریہ کہتے ہیں۔ صفحہ ۸۹ پر سلسلہ صابریہ کو مستند لکھا ہے اور اسی کو اپنے بیان میں مقدم بھی رکھا ہے: "حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دو ملفوظات۔ اسرار الاولیاء اور راحت القلوب مشہور و معروف ہیں۔ اسرار الاولیاء کے جامع حضرت بدر الدین اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں اور اس میں ۶۳۱ ھ کے بعد والے حالات ہیں۔ راحت القلوب کے مرتب حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ بتائے جاتے ہیں۔ اس میں ۶۵۵ ھ کے بعد والے اذکار ہیں۔ راحت القلوب کی حقیقت جو کچھ بھی ہو مگر سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کا خود ارشاد ہے کہ میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے اسرار الاولیاء کو حضرت حمید قلندر رحمۃ اللہ علیہ حضرت کیسودار رحمۃ اللہ علیہ اور صاحب جوہر فریدی صحیح نہیں سمجھتے بہر حال ان دونوں ملفوظات میں حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر برائے بیست بھی نہیں ہے۔"

میر حسن غلام سجزی بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات، فوائد القواد، کے نام سے جمع کئے تھے۔ اس کو حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نظر ثانی کی سعادت حاصل ہے۔ یہ کتاب ماہ شعبان ۱۳۵۵ ھ میں لکھنا

لے ان کا وصال دولت آباد میں، سال ۱۳۳۸ ھ میں ہوا۔

شروع کی گئی تھی اور ۱۲۲ھ میں یہ عہد غیاث الدین تغلق ختم ہوئی۔ یعنی حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال سے تین سال پہلے اور مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے ۳۵ برس بعد اس میں بھی مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ "افضل الفوائد" حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۱۳ ذوالحجہ ۱۳۱۳ھ کو لکھنا شروع کی تھی۔ اس کے حصہ دوم کا آغاز ۱۳۱۹ھ میں ہوا تھا۔ لیکن خاتمہ کا سال نہیں معلوم۔ اس کو فرضی خیال کیا جاتا ہے بہر حال اس میں بھی مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا حال نہیں ہے۔

۱۳۵۶ھ میں فیروز شاہ کے زمانہ میں حضرت حمید قلندر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات دخیر المجالس، لکھے تھے۔ یہ بھی مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ذکر سے خالی ہے۔ مختصر یہ کہ ان جملہ ملفوظات میں صرف مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہی نہیں بلکہ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور بھی حلقہ کار ذکر نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ جامعان ملفوظات ان سب کے مُنکر ہیں۔ عدم ذکر کی وجہ سے عدم وجود کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ذکر نہ ہونے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان کی مجالس میں کسی نے نہ ان صاحبان کے متعلق استفسار کیا اور نہ ذکر کیا۔

سلطان ناصر الدین محمود کے عہد (۸۰۱-۸۹۶ھ) میں سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ۱۳۹۷ھ کے قریب وجوار میں سید مبارک کرمانی عرف میر خوردر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "سیر الاولیاء" کے نام سے جمع کئے تھے۔ اس کتاب "سیر الاولیاء" کی اہمیت یوں بھی

۱۳ بقول خزینۃ الاصفیاء میر خوردر کا انتقال ۱۳۷۵ھ میں ہوا تھا اس لیے سیر الاولیاء کا سال تصنیف ۱۳۹۷ھ نہیں ہو سکتا۔ حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ اور میر خوردر رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال میں ۱۳۷۵ھ کا فصل ہے میر خوردر کو ۱۳۵۸ھ میں بقول انکے خواب میں سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ نے تجدید بیعت کی ہدایت کی تھی۔ لہذا سیر الاولیاء کا سال تصنیف ۱۳۶۰ھ اور ۱۳۷۵ھ کے وسط میں ہونا چاہیے۔

ہے کہ کرمانی خاندان حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ دونوں کا منظور نظر تھا۔ میر خور د کے دادا سید محمود کرمانی ترک وطن کر کے اجودھن میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال ۶۶۱ھ تک وہیں رہے۔ وہ ۶۶۳ھ میں اجودھن آئے تھے۔ گویا وہاں اٹھارہ سال کی سکونت ٹھہرتی ہے۔ ان کی اہلیہ بی بی رانی فریدی جماعت خانہ کے منتظمین میں سے تھیں ۱۰ اور انہوں نے حضرت علامہ الدین موج دریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو دودھ بھی پلایا تھا۔ موج دریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سال پیدائش ۶۵۱ھ ہے میر خور د نے خود بھی لکھا ہے کہ میرے والد حضرت موج دریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے رضا گاہ بھائی تھے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ نے کرمانی خاندان کو اپنے پاس دہلی بلا لیا تھا۔ میر خور د کے دادا سید محمود کرمانی کا انتقال ۱۰۰۰ھ میں ہوا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میر خور د کی پرورش - تربیت و تعلیم حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زیر سایہ ہوئی۔ ان کے نانا نے بچپن میں ہی انہیں سلطان جی کا مرید کر دیا تھا۔ خود لکھتے ہیں کہ دریں ایام درک معانی چنداں نہ بود۔ پھر اقرار کیا ہے کہ سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ

۱۰ یہ سال وصال حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق ہے۔

۱۱ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجودھن میں ننگر خانہ اسی زمانہ میں کھلا تھا۔

۱۲ سید محمود کرمانی کے چار صاحبزادے تھے۔ سید نور الدین کرمانی۔ سید کمال الدین امیر احمد کرمانی۔ سید قطب الدین حسن کرمانی ان تینوں کے مزار درگاہ سلطان جی میں چبوترہ بایاں میں ہیں۔ چوتھے صاحبزادے خاموش کرمانی تھے۔ ان کا انتقال دیوگیر میں ہوا تھا۔ سید نور الدین کرمانی کے تین صاحبزادے تھے۔ سید محمد کرمانی خلف اکبر تھے ان کا ہی عرف میر خور د ہے اور یہی سیرالاولیا کے جامع ہیں دوسرے صاحبزادے سید داؤد کرمانی تھے۔ اور تیسرے کا نام سید لقمان کرمانی تھا۔

کے وصال کے بعد، معاملہ نفس کہ دشمن دینی است بحسب مطلوب آنحضرت نہ بود اور نہایت ایمانداری سے وجہ بھی بتادی ہے کہ "غلبہ جوانی چنانکہ اُفتد و دانی مزاحم شد" اس کے بعد لکھا ہے کہ ۱۵ھ میں حضرت محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف خواب میں ہوا۔ چاہتا تھا کہ قدم لوں مگر کسانیکہ بودند مانع این دولت شدند۔ پھر دوبارہ خواب میں تجدید بیعت کا حکم ہوا اس وقت میری عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اب ہدایت و توفیق حاصل کر کے توبہ کی اور راہ راست اختیار کی۔ بعد میں حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے انہیں خلافت سے سرفراز فرمایا تھا۔ بچپن میں اپنے گھر والوں سے اور سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں جو حال دیکھے اور سنے تھے وہی سیرالاولیاء میں درج کئے ہیں۔ عرصہ کے سنے ہوئے حالات میں سہو و نسیان کا دخل ہو سکتا ہے۔ پھر اس کتاب کی مختلف اشاعتوں میں بھی تخریفیں ہوئی ہیں۔ غرض مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر اس کتاب میں بھی نہیں ہے۔ اپنے والد سے سُن کر جو روایت علی صابر ساکن ڈبکری کے متعلق سیرالاولیاء میں لکھی ہے اس کا اطلاق خدا جانے حضرت مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ سے کیسے کر دیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ سید محمود کرمانی حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بھانجے مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر اس مغایرت و اجنبیت سے نہیں کر سکتے تھے۔ نام کی کہیے تو وہ علی صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھا اور یہ علی احمد صابر ہیں۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت سے پہلے تک کے اکثر حالات و واقعات سید محمود کرمانی کی آنکھوں کے سامنے گزرے تھے۔ اگر یہ علی صابر غیر از مخدوم علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہوتا تو میر خور کو ظاہر کرنے میں تکلف نہ ہوتا کہ اس علی صابر سے مراد مخدوم علی احمد صابر ہیں جو حضرت شیخ ایشوخ عالم کے بھانجے اور داماد تھے۔ تحقیقت یہ ہے کہ میر خور کے والد نے اس دوسری شخصیت کو حضرت

مخدوم علی احمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر منطبق ہی نہیں کیا ہے اب جو لوگ دونوں کو ایک سمجھتے ہیں ان میں یقیناً شے لطیف کی کمی ہے۔

سیرالاولیاء میں دو تین روایتیں ایسی بھی ہیں جو روارومی میں بغیر سوچے سمجھے لکھ گئے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ بدرالدین اسحق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے جیتے جی ازراہ ادب سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کسی کو مرید نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ زلزال شدید میں مبتلا ہونے کی وجہ سے سلطان جی نے ۶۸۵ھ سے پہلے سلسلہ بیعت شروع نہیں کیا اور حضرت بدرالدین اسحق رحمۃ اللہ علیہ کا وصال اس سال سے پہلے ہو چکا تھا۔ اب اگر ان کا وصال ۶۸۵ھ کے بعد ہوا، تو سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مرید کرنا شروع کر دیئے تھے۔ غرض یہ روایت سیرالاولیاء کی صحت کا درجہ نہیں رکھتی۔

میر خورد نے خود ایک روایت اپنے والد کے متعلق لکھی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ یعنی وہ شیخ کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال سے دو تین دن پہلے دہلی سے اجودھن پہنچے تھے دیکھا کہ حجرے کے کواڑ بند ہیں اور باہر بس دیوار صاحبزادگان جانشینی کے متعلق جھگڑا کر رہے ہیں۔ انہوں نے حجرے کے اندر جانا چاہا تو صاحبزادگان نے اجازت نہیں دی۔ مگر کچھ دیر کے بعد آنکھ بچا کر وہ حجرے کے اندر پہنچ تو گئے۔ آہٹ پا کر شیخ کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے آنکھیں کھولیں اور بڑی شفقت سے دریافت کیا کہ سید کب آئے۔ عرض کیا کہ ابھی حاضر ہوا ہوں۔ اس کے بعد سید محمود کرمانی نے پہلے دہلی کے علما و مشائخ کے سلام پیش کیے اور سب کے آخر میں سلطان جی

۱۔ ان کے سال وصال کے متعلق اختلاف ہے۔ ان کے مزار پر حضرت خواجہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ نے سال وصال ۶۹۲ھ کندہ کر دیا ہے۔ انوار الفردوس میں سال وصال ۶۶۷ھ درج ہے اور میری تحقیق کے مطابق ان کا سال وصال ۶۹۰ھ ہے جس کی تشریح میں نے سوانح بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں کی ہے۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سلام پہنچایا۔ نام سنتے ہی پوچھا وہ کیسے ہیں اور حکم دیا کہ یہ عصا۔ یہ مصلے اور یہ جامہ انہیں دے دینا۔ پھر فوراً ہی فرمایا کہ فی الحال یہ سب تبرکات بدرالدین اسحق رحمۃ اللہ علیہ کے پاس امانت رکھ دو جب ان عطیات کی خبر صاحبزادگان کو ہوئی تو انہوں نے سوء مزاجی کا اظہار فرمایا کیونکہ وہ سب انہیں سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا خیر خواہ سمجھتے تھے اور خیال کیا کہ ان کی وجہ سے یہ عطیات دیئے گئے ہیں۔ اس پر سید محمود کرمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے معذرت پیش کی کہ میں نے سفارش نہیں کی تھی۔ ان کا سلام بھی احتیاطاً سب سے آخر میں کہا تھا۔ اب یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ یہ سب نعمتیں انہیں عطا فرمائیں، اگر یہ یہاں صحیح ہے تو سید صاحب کی ذہنیت و فراست کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وقت بیعت ۱۵۶ھ میں پہلے ہی کلاہ چارٹر کی عصا۔ خرقہ۔ چوہی نعلین اور دستار سلطان جی علیہ الرحمۃ کو حرمت کر دی تھیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ صاحبزادگان نے بلا حجت متفقہ طور پر حضرت بدرالدین سلیمان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سجادہ نشین منتخب کیا تھا اور حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے آخری وقت میں جانشینی کے متعلق جھگڑا کرنا اخلاق اور فطرت کے خلاف بھی تھا۔ جس کو عقل قبول نہیں کر سکتی۔ غرض اسی قسم کی خامیوں کی وجہ سے حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی رائے ہے کہ سولے فوائد الفواد کے سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے جتنے بھی تذکرے ہیں وہ سب نامعتبر ہیں۔ صوفی محمد جان مراد آبادی صابری نے اپنی کتاب "قول فیصل" میں لکھا ہے کہ ۱۸۸۲ء میں لالہ چرن جی لال ساکن نغیاث پور نے اپنے مطبع سے سیر الاولیاء شائع کی تھی۔ اس کے دیباچہ میں لالہ صاحب نے بتایا ہے کہ یہ کتاب خالص حضرت مولانا فخر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قلمی نسخہ سے نقل کروائی گئی ہے اس لیے اس کے معتبر ہونے میں شک نہیں کیا جاسکتا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا ہے کہ جو سقم کتاب کی اصل عبارت میں پایا اس کو بخوف تحریف

ویسے ہی نقل کر دیا۔ (معاذ اللہ) اس کے بعد یہ بھی تحریر ہے کہ بعد طبع کتاب جو مطالب دیکر مقامات سے ملے وہ علیحدہ طبع کرا کے شامل کتاب کر دیتے ہیں۔ (مگر حوالہ نہیں دیا ہے کہ وہ مطالب کہاں سے ملے) چند سال ہوتے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی کتاب ”نظام تعلیم و تربیت“ شائع ہوتی ہے۔ مولانا میر خور د کے معترف و قدردان ہیں ان کے حوالوں سے اپنی کتاب کی عزت بڑھائی ہے مگر حصہ دوم میں انہوں نے بھی سیر الاولیاء کی الحاقی روایتوں کی تکذیب کرتے ہوئے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بیان میں لکھا ہے ”معلوم ہوتا ہے کہ ان پر (یعنی میر خور د پر) سلطان المشائخ کا وہ پختہ چستی رنگ نہیں چڑھا تھا۔ جو سلطان جی کے خلفاء و مریدین کی خاص شان ہے۔ اس لیے بعض مواقع میں ان کی تعبیریں حدود احتیاط سے متجاوز نظر آتی ہیں۔ یعنی بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دوسرے خلفاء خصوصاً سلسلہ صابری کے شیخ حضرت علی صابری صاحب کلیر شریف کا ذکر کچھ ایسے انداز میں کیا ہے گویا ان کو بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں چنداں اہمیت نہیں تھی۔ اگچھ یہ الفاظ بھی لکھے ہیں کہ شیخ صابری درویشے قدم ثابت و نفس گیرا دوست ساکن ڈیکری بودے۔۔۔ بلکہ اور بھوکا کا ترجمہ کیا ہے عیشے خوش خواہد گشت مگر شیخ کا جو مقام ہے اس لحاظ سے اتنے الفاظ ناکافی خیال کیے جاسکتے ہیں“ بہر حال ان فضول روایتوں سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہی فرضی روایتیں بنارس قنادین گتی ہیں۔

مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال سے تقریباً ڈیڑھ سو سال اور

۱۔ صابری کلیر کا نام علی احمد صابری ہے نہ کہ علی صابری

۲۔ مولانا کو اشتباہ ہو گیا۔ بیان کردہ تعریف ڈیکری والے علی صابری کی ہے مخدوم علی احمد صابری

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر منطبق نہیں ہو سکتی۔

سیر الاولیاء کے وجود میں آنے کے تیس تیس سال بعد حضرت شیخ احمد اشرف یحییٰ منیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات لطائف اشرفی کے نام سے زیر ترتیب تھے۔ اس کے صفحہ ۳۶ پر مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تعارف اس طرح ہے کہ "حضرت قطب المشائخ شیخ علی احمد صابر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ از کمل خلفائے شیخ کبیر اند" ثابت ہوا کہ حضرت کا نام نامی مشہور انام تھا اور ان کا ذکر ادب سے کیا جاتا تھا۔ اگر ان کے متعلق یہ فروری روایتیں اس وقت سیر الاولیاء میں درج ہوتیں تو "لطائف اشرفی" میں ان کے متعلق کچھ نہ کچھ تو اشارہ ہوتا۔ نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ تحریریں بعد کی ہیں۔

سیر العارفین مولانا جمالی ہانسوی سہروردی کی مشہور و معروف تصنیف ہے اس میں بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ علی بہاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تک کا ذکر ہے مگر نہیں ہے تو حضرت مخدوم علیہ الرحمۃ کا۔ ان کا ذکر ایسے وقت میں حذف کیا گیا ہے جبکہ مولانا جمالی کے ہم عصر شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نہایت آب و تاب سے سلسلہ صابری کی اشاعت فرما رہے تھے اور جناب جمالی سلسلہ صابری کی ترقی و مقبولیت بہ چشم خود دیکھ رہے تھے اس چشم پوشی کا سبب وہ اختلاف ہو سکتا ہے جو اس زمانہ میں چشتیوں اور سہروردیوں میں ہو گیا تھا۔ یا پھر اس کی وجہ حضرت جمالی کی ذاتی پُر قاش بھی ہو سکتی ہے۔ جمالی سکندری لوڈھی کے مشیر خاص تھے۔ ابراہیم لوڈھی سے اختلاف ہو جانے پر وہ بادشاہ ہمایوں کے یہاں آگئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سیر العارفین ہمایوں ہی کے نام مَعْنُون کی ہے۔ مگر شیخ عبدالقدوس کے سلسلے کا چراغ نہ جل سکا۔ کیونکہ ہمایوں شیخ عبدالقدوس کا معتقد یا بقول ابوالفضل مرید تھا مولانا جمالی کا انتقال ۹۴۲ھ میں ہوا اور حضرت شیخ عبدالقدوس نے ۹۴۴ھ میں پر وہ فرمایا۔

۱۔ جمالی حضرت جمال ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہموطن تھے۔ ممکن ہے کہ ان سے قرابت بھی ہو۔ اسلامی ممالک کی سیاحت کے بعد لوڈھیوں کے عہد میں ہندوستان واپس آئے تھے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۹۹۹ھ میں "اخبار الاخیاء" لکھی تھی۔ اکبری دور کی یہ مستند کتاب ہے۔ محدث صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان غلط روایتوں کی جو سیر الاولیاء میں صاحب کلیر کے متعلق ہیں سب سے پہلے تردید کی ہے۔ انہوں نے گرفت کی کہ "اس شیخ علی صابر کہ داماد شیخ فرید الدین و خلیفہ اُبود۔ قیراؤ در کلیر است و سلسلہ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وغیرہ یہ وہ منتهی می شود و فکر اُود سیر الاولیاء صلا نہ کردہ و ترک ذکر او خالی از غرابت نیست" یہ آخری فقرہ ہی ٹیپ کا بند ہے۔ اس کے بعد ازراہ احتیاط یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "تواند کہ از شیخ علی صابر ہمیں شیخ صابر باشد" اس تواند سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جو نسخہ سیر الاولیاء کا محدث صاحب کے پاس تھا اس میں علی صابر کا ساکن ٹیکری ہوتا درج نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو وہ تواند کا لفظ لکھ کر شبہہ کا فائدہ نہ دیتے پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ وہ شیخ علی صابر اور صابریں امتیاز بھی کرتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہانسی کے نزاع کا قصہ اخبار الاخیاء کی تصنیف کے بعد کی ایجاد ہے۔ محدث صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۹۹۶ھ میں حجاز گئے تھے اور ۱۰۰۰ھ میں واپس آئے تھے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ اخبار الاخیاء حجاز میں لکھی تھی۔ واللہ اعلم۔

اکبری عہد میں مذہبی اقدار کی نوعیت میں لودیوں کے عہد سے بھی زیادہ ابتذال ہو گیا تھا۔ ارتداد کی جگہ الحاد نے لے لی تھی۔ اور عملیات و جنتر منتر جزو ایمان بن گئے تھے۔ ایرانی جو ہمایوں کے ساتھ آئے تھے انہوں نے اپنے عقائد کی اشاعت زور شور سے کی۔ پھر اکبری کی تقویت پر ویدانتی۔ آتش پرست۔ زرتشتی۔ عیسائی اور دیگر مذاہب بھی آگڑھ آئیاں

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ان کے مرشد حضرت سمار التبرین جتید عالم تھے۔ ہندوستان واپس آکر جمالی نے بیر عارفین مرتب کی تھی۔

یہ لگے جتنی کہ درویشی کے معیار و تقدس میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی۔ سینکڑوں مصنوعی صوفی وجود میں آگئے اور طرح طرح کی شعبہ بازیوں دکھانے لگے۔ مخالفین نے جب مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق نئی نئی خلاف آئین روایتیں تراشیں تو معتقدین نے اپنی آبرورکھنے کے لیے ان ہرزہ سراہیوں کو حسب مراد بنا لیا۔ چنانچہ اکبری عہد میں ایک صوفی مرزا علی بیگ تھے "ثمرات القدس" ان کی تصنیف ہے۔ ۱۰۹۰ھ میں لکھی گئی تھی۔ انہوں نے نہایت وثوق سے سیرالاولیاء کے نامعلوم الاسم مرید کی الحاقی روایت کو صحیح سمجھا۔ پھر یہ بھی تسلیم کر لیا کہ حضرت جمال ہانسوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سندوں کے رد و قبول کا اختیار تھا (صفحہ ۳۵)۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق ایک انوکھی اور اچھوتی روایت لکھ ڈالی ہے کہ "بعضے علماء در رسائل خود سے را خواہر زادہ گنج شکر قدس سرہ نوشتہ اند جمعے دیگر گوید کہ صابر مردے بود کہ ہمیشہ شیخ الاسلام در حبالہ عقد و سے بود۔ ازوے فرزند علی صاحب نام تولد شد کہ الحال اکثر عزیزان چشتیہ علیہم اللہ تعالیٰ بہ و سے استناد دارند۔ علی تبوکل تقدیریں مردے بود صاحب سنیہ و عادات فاخرہ و مستجاب الدعوات خواست کہ عالم را اسیرے نماید۔ از گنج شکر التماس رخصت کرد۔ مرخص نمود۔ در ہنگام وداع فرمود کہ اے علی صابر امید دارم کہ تمام عمر خوش وقت باشی۔ گوئید کہ تازلیست اوقات و سے بہ خوشی و خرمی بگذشت (صفحہ ۲۱۸)؛ معلوم ہوتا ہے کہ ان صوفی صاحب کی روحانیت اس درجہ بلند تھی کہ ان کی عقل شریف شرمندہ ہو کر تخت الشریٰ میں جا چھپی تھی۔ انہوں نے

۱۔ اس کا قلمی نسخہ شہر قمبر ضلع شیخوپورہ پنجاب میں صاحبزادہ نصرت نوشا ہی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کی عبارت ثولیدہ ہے۔

۲۔ ماخذ از تذکرہ علمائے ہند، تالیف مولوی رحمان علی صاحب۔

بڑی خوبی سے سیرالاولیا کی مختلف غیر متعلق روایتوں میں ربط پیدا کر کے اپنے باطنی علم سے ایک نئے وجود کی تخلیق کر دی ہے اور اپنی ذاتی تحقیق سے نسب و ولدیت کے متعلق بھی اپنے انیکز انکشاف کیا ہے۔ حضرت عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کی شاندار تعلیم و تبلیغ کے باوجود یہ کی فضا گندگی سے نہیں بچ سکی۔ اب اس کا کیا علاج کہ آج بھی بعض لوگ اپنی تنگ ذہنیت کی وجہ سے اکبری دور کے صوفیائے خام و اشرار کو حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہی تعلیم کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اپنی تاریخ دانی پر فخر کرتے ہیں۔ ثمرات القدس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اسناد کے رد و قبول کا اختیار حاصل تھا مگر انہوں نے ابھی تک استعمال نہیں کیا تھا کیونکہ نزاع ہانسی کا معرکہ ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا۔ اگر اس مفروضہ نزاع کی ذرا بھی خبر مرزا صاحب کو ہو جاتی تو خدا جانے کیسی کیسی گل افشانی فرماتے ان کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک علی صابر کو ساکن ڈیکری بھی قرار نہیں دیا گیا تھا۔

میر عبدالواحد بلگرامی اکبر عہد کے نامی گرامی علماء میں سے ہیں۔ سلسلہ نظامیہ کی خلافت انہیں حاصل تھی۔ ان کی وفات جہانگیر کے عہد میں ۱۰۱۶ھ میں ہوئی تھی۔ وفات سے پہلے ۱۰۱۶ھ میں "سبع سائل" تصنیف کی تھی۔ یہ مشہور و معروف کتاب ہے مگر اغلاط سے خالی نہیں ہے۔ لکھا ہے کہ "شیخ جمال بزرگ تر بودند۔ روزے شیخ فرید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ خواہر زادہ خود را کہ شیخ علی صابر نام داشت خلافت عطا کرد و بر شیخ جمال فرستاد۔ چوں پیش جمال رسید شیخ جمال جامہ خلافت از ایشان باز گرفتند کہ شما لیاقت این جامہ نہ دارید۔" آن خواہر زادہ بر مندوم شیخ فرید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آمد۔ ماجرا گفت۔ محندوم

۱۔ ملاحظہ ہو کتاب "دین الہی اور اس کا پس منظر" پروفیسر محمد سلیم مؤلف۔

فرید الدین فرمود کہ شیخ جمال ازہر کہ جامہ خلافت بتانہ فرید اور ادا دن نتواند؛ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نزاع مانسی جہانگیر کے ابتدائی عہد میں ہوا تھا۔ میر صاحب نے جامہ خلافت چھین لینے کی وجہ نہیں بتاتی ہے اور سخت حیرت ہے کہ آئین طریقت سے واقفیت رکھتے ہوئے کیسے لکھ دیا کہ مرشد اپنے خلیفہ کو ایسا اختیار دے سکتا ہے اور خلیفہ مرشد کی عطا کردہ سند کو مسترد کر سکتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت جمال کو بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خواہر زادے علی احمد صابر سے شروع سے ہی دلچسپی تھی جبکہ آٹھ برس کی عمر میں وہ اجودھن لائے گئے تھے اور حضرت جمال مدارج حاصل کر رہے تھے۔ غالباً علی صابر ساکن ڈبکری سے میر صاحب ناواقف تھے ورنہ اس کے متعلق سکوت اختیار نہ کرتے۔ ناممکن ہے کہ انہوں نے سیرالاولیاء میں نامعلوم الاسم مرید کا قصہ نہ پڑھا ہو اور اخبار الاخبار میں محدث صاحب کی رائے علی صابر کے متعلق نہ دیکھی ہو۔

شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق ردو لوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کرامتیں، "انوار العیون" میں جمع کی ہیں۔ ان کی معلومات معتبر ہیں۔ ان کرامتوں سے حضرت شیخ العالم کی کیفیات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور جن مقامات میں ان کا ظہور و صدور ہوا ہے وہاں کے اس وقت کے حالات کا بھی پتہ چل جاتا ہے اگر ایک دو کرامتیں ناقابل فہم ہیں تو ان میں ظن و تخمین کا دخل نہیں ہے بلکہ معتبر راویوں کا مبالغہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں "در ممکنون" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کرامتیں اگرچہ شرط ولایت نہیں۔ مگر درویشوں اور خصوصاً مجذوب سالکوں کے حالات میں سوائے کرامتوں کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے کیونکہ یہ صاحبان ظاہری رسوم کے پابند نہیں ہوتے۔ اور تکلف و نمائش سے بری ہوتے ہیں۔ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نے حضرت شیخ العالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے چالیس سال بعد ان کی روحانیت سے
فیس حاصل کر کے ان کے پوتے اور حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے صاحبزادے
حضرت شیخ محمد سے خلافت پائی تھی۔ ان کی یہ تصنیف مثالی ہے مگر افسوس کہ بعد والوں نے
ان کے طرز کا اتباع نہیں کیا۔

سلسلہ صابری کی تجدید کے بعد مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا پہلا تذکرہ
”گلزار ابرار“ خیال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے قرشتہ (متوفی ۱۲۳۳ھ) نے اپنی تاریخ
میں حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا کچھ ذکر کیا ہے گلزار ابرار مولانا محمد غوثی شطاری
کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ صاحب بمقام مانڈو ۱۹۶۳ھ میں پیدا ہوئے تھے اور سید محمد غوث
گوایاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۲۹۵ھ) کے مرید تھے ۱۹۹۵ھ میں حجاز جاتے ہوئے محدث
دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کچھ دن مانڈو میں قیام کیا تھا۔ اسی وقت محمد غوثی کو ان سے نیاز حاصل
ہوا تھا۔ گلزار ابرار میں خود لکھا ہے کہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بہت کچھ فیروزی و فرخندگی
کے فوائد حاصل کئے تھے۔ گلزار ابرار کلسال تصنیف ۱۲۲۲ھ ہے گویا یہ جہانگیر کے عہد میں لکھی
گئی تھی قرشتہ اور محمد غوثی کی کارگزاری یہ ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو روشناس کرایا اور
شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ علیہ کا کارنامہ یہ ہے کہ شیخ العالم کے جدید طرز کا تعارف کیا۔ شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ علیہ نے امرار و
سلاطین سے روابط و ضوابط کو جائز رکھا حالانکہ متقدمین چشتیہ کا یہ دستور نہیں تھا، لہذا محمد غوثی پر اس وجہ سے اعتراض کئے
جاتے تھے ان اعتراضوں کی تردید انہوں نے بھرپور کی ہے مگر اصل یہ ہے کہ شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ
علیہ نے امرار و سلاطین سے تعلقات رکھنے میں ضرورتِ زمانہ کے بموجب حضرت شیخ العالم
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تقلید کی ہے۔

گلزار ابرار میں ہانسی کے نزاع کا ذکر موجود ہے۔ یہ مزید ثبوت ہے کہ ہانسی

کے نزاع کی داستان جہانگیر کے عہد میں تراشی گئی تھی۔ اس سے پہلے اس کا وجود نہ تھا۔ شیخ علی صغیر فریدی چشتی کی کتاب ”جواہر فریدی“ مشہور ہے۔ یہ کتاب پاک پٹن شریف کے قیام میں وہاں کے بزرگوں سے حالات معلوم کر کے لکھی تھی اور ان کا ماخذ وہاں کا مشہور تذکرہ ”گلشن اولیا“ بھی تھا جو ہر فریدی کی بعض روایتیں مشکوک ہیں۔ اس میں شجرہ درج نہیں ہے۔ صفحہ ۳۰۵ اور بزرگوں کے عرسوں کی فہرست میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عرس کی تاریخ درج نہیں ہے۔ گویا اس وقت حضرت کا عرس شروع نہیں ہوا تھا۔ (صفحہ ۲۳۳) ہزبرہ غاتون کے لطن سے نین صاحبزادیوں کے نام لکھے ہیں۔ بی بی فاطمہ۔ بی بی مستورہ اور بی بی شریفہ (صفحہ ۳۰۲) صفحہ ۳۸۶ پر بحوالہ سیلا اولیا۔ لکھا ہے کہ بی بی مستورہ کے شوہر عمر صوفی تھے۔ بی بی فاطمہ کو اہلیہ بدر الدین اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ درج کیا ہے۔ بی بی شریفہ کے متعلق بتایا ہے کہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ پھر معلوم نہیں کس طرح صفحہ ۳۹۶ پر نمط راز ہیں کہ ان کا عقد مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ہوا تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ غرض یہ حضرت بی بی شریفہ کے متعلق گول مول ہو کر رہ گئے ہیں۔

سیر الاقطاب شیخ اللہ دیا کیر انومی چشتی کی معرکہ الآراء تصنیف ہے۔ فراست و فہانت اور طلسمات کا نایاب شاہکار ہے یہ واحد و شاید کتاب ۳۶۱ھ کی تصنیف ہے۔ تاریخ مشائخ چشت میں پروفیسر خلیق نظامی صاحب نے بھی اسی سال تصنیف کی تصدیق کی ہے مگر خود اللہ دیا کیر انومی چشتی نے اس کے خاتمہ میں اپنی اس تصنیف کا سال ۵۶۱ھ تحریر فرمایا ہے۔ گویا یہ شاہجہان کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس کتاب کی نسبت حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خواب میں پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور عالم اسباب میں شاہجہان بادشاہ نے شرف قبولیت بخشا تھا۔ شاہجہان کی خدمت میں یہ کتاب اس وقت پیش کی گئی تھی جب وہ کابل کو جا رہے تھے۔ لہذا کتاب کے ساتھ مصنف کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ شاہجہان نے کابل کا سفر تین مرتبہ

ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۸۸ء میں دوسری مرتبہ ۱۸۸۹ء میں اور تیسری مرتبہ ۱۸۹۰ء میں۔ اس کے
 کیرانوی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اندریں ایام تصنیف در ۱۸۶۹ء در عین راسہ اجمیر
 بودم؛ اگر سال تصنیف ۱۸۶۹ء ہے تو سفر کابل کی روایت محض خیالی اور غلط ٹھہرتی ہے
 اور اگر سال تصنیف ۱۸۶۷ء ہے تو طے نہیں کیا جاسکتا کہ بادشاہ ان کو اپنے کونے سفر میں
 لے گئے تھے۔ اور اگر یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں طیار ہوئی تھی تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ تیسرے سفر
 کابل میں یہ سال ۱۸۵۸ء کیرانوی صاحب کو شاہجہان نے ہمرکابی کی عزت بخشی تھی۔
 اعلم۔ سفر کابل اور وہاں کے قیام کی روداد از قسم کرامت ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شاہ
 کو بادشاہ جھیل کے کنارے اس کتاب کا مطالعہ فرما رہے تھے عصر کی نماز کو اٹھے تو
 وہیں چھوڑ گئے۔ واپس آکر دیکھا تو کتاب غائب تھی ہر چند تلاش کی مگر نہیں ملی۔ دوسرے
 دن اس کتاب کی جلد کے پشتے جھیل میں شناوری کر رہے تھے۔ جب جھیل کی تہ سے کتاب
 نکالی گئی تو سب حاضرین نے ملاحظہ کیا کہ رات بھر کے غسل کے بعد کتاب کے صرف
 حاشیوں پر پانی نے اثر کیا تھا۔ اور کاغذ و روشنائی پر پانی کا برائے نام بھی اثر نہیں ہوا
 اس کتاب میں ہانسی کے نزاع کی داستان شاعرانہ انداز میں لکھی ہے یعنی مخدوم پاک رحمۃ اللہ
 تعالیٰ علیہ اپنی سند پر مہر لگوانے مجمع کثیر کے ساتھ بالکی میں بیٹھ کر وہاں گئے تھے۔ خانقاہ کے در
 پر حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شاندار استقبال کیا تھا مگر مخدوم بغیر ادھر ادھر دیکھے ہوئے
 بے نیازی کے ساتھ سیدھے مندر پر جا کر جلوہ افروز ہو گئے۔ بعد مغرب سند پر مہر لگانے پر
 کیا تو مجبوراً حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے چراغ منکوا یا۔ مگر وہ ہوا سے گل ہو گیا۔ اس
 وقت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے دم آتشین سے با اپنی انگشت مبارک کو جا
 کر چراغ روشن کر دیا یہ دیکھ کر حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں بھی حرارت پیدا ہو گئی

اور سند چاک کر کے فرمایا تم خلافت کے لائق نہیں ہو۔ اور دہلی تمہارے جلال کی تاب نہیں لاسکے گی اس پر مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی اظہار جلال کیا اور فرمایا تم نے میری سند چاک کی ہے تو میں نے بھی تمہارا سلسلہ منقطع کر دیا۔ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے گہرا کر ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ میرا سلسلہ کس طرف سے قطع کیا ہے۔ جلالی شان سے جواب دیا گیا: ”اوپر سے“ اُدھر اجودھن میں بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پریشان تھے کہ آپس میں دو شیر جُٹ گئے ہیں خدا خیر کرے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اجودھن پہنچ کر ماجرا بیان کیا۔ تو حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا تیرا خطنامی شود۔ یہ بتاؤ سلسلہ جمال کا کس طرف سے تم نے چاک کیا ہے عرض کیا کہ اُوپر سے۔ یہ سن کر شیخ کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شکر ادا کیا کہ آخر تو سلامت رہا۔ اس کے بعد علی دی کہ جمال کے پھاڑے ہوئے کو اگرچہ میں جوڑ نہیں سکتا۔ لیکن اپنے ہاتھ سے لکھ کر تمہیں کلیر کی ولایت لکھ دوں گا، اس مفروضہ جواب سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مخدوم کی ولایت دہلی کا پروانہ چاک کیا تھا۔ اور سند خلافت سلامت رہی تھی۔ جب بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مخدوم کو کلیر رخصت کیا تو فرمایا کہ لوح محفوظ میں مستور ہے کہ تمہارا ایک خلیفہ جمال کے سلسلہ کو جاری کرنے کی دعا کرے گا تو دعا قبول ہوگی لہذا تم بھی اپنی زبان سے کہو کہ جمال کا سلسلہ جاری ہو جائے۔ حکمِ حاکمِ مرگِ مفاجات۔ اس لیے بادل ناخواستہ کہتا ہی پڑا۔

شیخ اللہ دیا کیر انومی حشتی نے حضرت کبیر اللادیا مہ کے احوال میں لکھا ہے کہ جب وہ ہانسی پہنچے تو حضرت جمال نے نہایت تداامت سے گزارش کی کہ میرے

لے آخر تھا ہی کب کہ سلامت رہتا۔ البتہ شیخ کبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ

علیہ کی (عیاذ باللہ) نسبت جاتی رہی۔

سلسلہ کے اجرا کے لیے دعا فرمادیتے۔ چنانچہ انہوں نے دعا کر دی۔ قبولیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جمال کے پوتے حضرت نور الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو شکستہ میں حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے سلسلہ نظامی کی خلافت سے سرفراز فرمادیا۔ یہ جمالی نہیں ہو بلکہ نظامی سلسلہ سے منسلک ہوتے اور اپنے شجرہ میں اپنے نام سے پہلے حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اسم گرامی لکھا کرتے تھے۔ اللہ ویا صاحب کا انکشاف ہے کہ سلسلہ جاری ہو گیا مگر مقبول نہیں ہوا اس لیے کہ بابا صاحب علیہ الرحمۃ کے حکم سے اس کے جاری کئے جانے کے متعلق مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہہ تو دیا تھا مگر صاف دلی سے نہیں کتھا۔ حضرت کبیر الاولیاء کی دعا کا اثر بھی قابل غور ہے یعنی حضرت جمال کے وصال کے بعد بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان کے چھ مہینے کے صاحبزادے صوفی برہان الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بچپن ہی میں مرید کر کے خلافت عطا کر دی تھی پھر صوفی برہان الدین کا وصال ۶۹۹ میں ہوا اسی سال ان کے صاحبزادے حضرت قطب الدین منور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پیدا ہوئے آٹھ سال کی عمر میں حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے انہیں خلافت عطا فرمائی۔ اور اسی دن حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بھی خلافت سے نوازا تھا۔ قطب الدین منور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ۷۶۰ھ میں ہوا تھا۔ ان کے صاحبزادے نور الدین رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سیر الاقطاب صفحہ نمبر ۲۰۲ سطر ۲۱

۲۔ سیر الاقطاب صفحہ ۱۸۱ سطر ۱۲

۳۔ حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پہلی مرتبہ ۱۸۰ھ میں دہلی آئے تھے۔ ان کی سند پر تاریخ

۱۸۳۲ھ لکھی ہے لہذا ایک ساتھ خلافت ملنے کی روایت صحیح نہیں ہو سکتی (ماخوذ از بزم صوفیہ

مرتبہ صباح الدین عبدالرحمن صاحب۔

لوچھ مہینے کی عمر میں سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی خلافت دی تھی۔ ان حقائق کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ۱۲۵۹ھ میں ہوا تھا۔ اور نرت کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حضرت ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے خلافت ۱۲۵۸ھ میں ملی تھی لہذا حضرت جمال اور کبیر الاولیاء کی ملاقات بعد از قیاس ہے۔ سیر الاقطاب کے مطابق کبیر الاولیاء چالیس سال کی سیاحت کے بعد پانی پت آئے تھے۔ اور مرشد کی تلاش میں سرگرداں تھے اسی سلسلہ میں ان کا گزر ہانسی میں ہوا تھا۔ کبیر الاولیاء کے وصال کی تاریخ ۱۲۵۵ھ لکھی ہے اور ان کی عمر ایک سو بہتر برس کی بتائی ہے۔ اسی موقع پر حضرت جمال نے ان سے اجوائے سلسلہ کی درخواست کی تھی۔ اگرچہ اس وقت کبیر الاولیاء درجہ کمال کو نہیں پہنچے تھے۔ دعا کرنے کے بعد انہوں نے تلاش مرشد کے لیے سفر جاری رکھنا چاہا۔ تو حضرت جمال رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ہدایت کی کہ پانی پت واپس جاتیں وہیں مرشد ملے گا۔ چنانچہ وہ بالآخر ۱۲۵۸ھ میں پانی پت واپس چلے گئے۔ حضرت مخدوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تجہیز و تدفین کرنے کے بعد ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۱۲۶۹ھ میں وطن واپس آئے تھے۔ عرصہ دراز کے بعد کبیر الاولیاء کی رسائی ان کی خدمت میں ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے اپنے وصال سے تین سال پہلے کبیر الاولیاء کو خلافت ۱۲۷۲ھ میں دی تھی۔ ان واقعات سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس کو تسلیم کر لینا ہر عامی کا کام نہیں۔ سلسلہ جمالی کا منقطع ہو جانا پھر کبیر الاولیاء کی دعا سے جاری ہوتا جب کبیر الاولیاء کو خلافت نہیں ملی کسی اور کمال کو نہیں پہنچے تھے ایک کرامت واقعہ یہ ہے کہ کسی کو خلافت نہ دے سکنے کی وجہ سے حضرت جمال کا سلسلہ چلا ہی نہیں اب سوال یہ ہے کہ ایک مخدوم شے کو مخدوم خطاب

۱۔ سیر الاقطاب صفحہ نمبر ۲۰۲ سطر ۱۸۔

۲۔ سیر الاقطاب صفحہ ۲۰۳ سطر ۱۹۔

نے منقطع کیسے کر دیا بالفرض منقطع کر دیا تو اوپر سے منقطع کیا تھا لہذا مطلب یہی ہو کہ حضرت جمال کو حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جو خلافت دی تھی اس کو منقطع کیا اندریں حالات ان بیانات کو وہ مان سکتے ہیں جن کو شیخ اللہ دیا جیسی عقل ملی ہے۔ سلسلہ جمالی کی داستان جو کیرانوی صاحب نے سنائی ہے اس کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ آفریں باد بیریں ہمت مرانہ او۔ اس کے شکریہ میں جمالی حضرات کا فرض عین ہے کہ دھوم دھام سے کیرانوی صاحب کا عرس کیا کریں۔

جناب کیرانوی صاحب اس نتیجہ پر بھی پہنچے ہیں کہ ہانسی کے نزاع کی وجہ سے چونکہ حضرت جمال کو (عیاذ باللہ) عناد تھا اس لیے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات میں مخدوم پاک کا ذکر انہوں نے لکھتے نہیں دیا۔ واقعی بڑی دور کی کوڑی لائے۔ مادیت اور روحانیت دونوں دنک ہو کر رہ گئیں۔ کیرانوی صاحب کے علم میں یہ بھی ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کلیئر میں عتاب کرنے کی اجازت پہلے ہی بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے حاصل کر لی تھی۔ لیکن جب ان کے جلال و عتاب کی خبر بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ملی تو ہاتھ مل کر رہ گئے۔ اور فرمایا کہ ”آں ملک مع مضافات بہ تصرف اوست ہر چہ داند بہ کند۔ مختار است“ کیرانوی صاحب کے علم میں یہ بھی تھا کہ مخدوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں گہرے تعلقات تھے۔ جب دہلی کوئی آتا تو مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دل کھول کر تواضع فرماتے تھے۔ جب ان کے استغراق میں ایک بارات کا باجا رخنہ انداز ہوا تو اس بارات کو انہوں نے جنگل میں مجبوس کر دیا لیکن جب سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سفارش فرمائی تو بارات کو قید سے رہائی دی۔ ان مراسم و روابط کا سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ملفوظات

س برائے نام بھی ذکر نہیں ہے۔ تاریخی حالات اور ان دونوں بزرگوں کے واقعات سے
 بت ہے کہ ملاقات تو بطرف ان میں ظاہری دید و شنید بھی نہیں تھی۔ کبر انومی صاحب
 نے ایک عجیب راز کا انکشاف کیا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت بہام الدین زکریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
 حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر فریفتہ ہو گئے تھے اور انہوں نے بابا صاحب رحمۃ اللہ
 تعالیٰ علیہ سے استدعا کی تھی کہ میرے سب مرید لے لیجئے اور جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو
 بٹھے دے دیجئے۔ انہیں جواب یہ دیا گیا کہ تبادلہ مال میں ہوتا ہے جمال میں نہیں ہوا کرتا۔
 اس سوکھے جواب پر حضرت زکریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شیخ جمال را بہ جذب باطن سوتے
 و کثیدہ۔ لہذا حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بار بار
 تان جانے کی اجازت مانگا کرتے تھے۔ اکتا کہ اجازت دی کہ بروادتی خود سیاہ کُن، نقل کُفر
 غرنہ باشد بقول کیر انومی صاحب حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا روئے جمیل اسی وقت سیاہ
 ہو گیا۔ اور وہ عرصہ تک جنگلوں میں گریہ و زاری کرتے رہے۔ آخر کار ایک تاجر مسمی عالم نے
 سفارش کی تو ذیل کی رباعی بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھوا کر حضرت کو بھجوا دی۔

رَدِ گَرِ دِجہان بگر دو پا آبلہ کُن گر بچوں منے یا بی مارا بلہ کُن
 یک صبح یہ اخلاص بیا پر دریا گر کار تو بر نہ آید۔ گلہ کُن

یہ رباعی نہ بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے نہ ان کے کسی ہم عصر کی ہے دراصل یہ رباعی
 بہام الدین نقشبند کی ہے جو بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے پچاس سال بعد
 لکھی گئی تھی۔ یہ روایت کیر انومی صاحب نے شاید یوں لکھی ہے کہ ہانسی ولے نزاع کا
 انہیں حضرت جمال سے انتقام لینا تھا۔ مگر انہیں خیال نہیں رہا کہ اس روایت سے
 سہروردی حضرات بُرا مانیں گے۔

صاحب سیرالاقطاب کی نظر بہت بلند تھی وہ آسمان سے تارے توڑ لاتے تھے اور لوح محفوظ پر ہمیشہ نظر رکھتے تھے۔ انہیں جب علم ہوا کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بڑے پایہ کے شاعر ہیں تو ان کا دیوان حاصل کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر نہیں مل سکا اور نہ لوح محفوظ پر اس کے متعلق کوئی تحریر تھی مگر قابل مبارکباد ہیں اور یہ ان کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں فارسی کی ایک غزل مل سکی اور ایک اُردو کا شعر دستیاب ہوا۔ فارسی کی غزل وہ ہے جس کا مقطع ہے :-

احمد بہشت و دوزخ بر عاشقان حرام است

ہر دم رضا، جانان رضوان شد است مارا

لیکن ظاہر ہے نقادوں کی رائے ہے کہ یہ غزل حضرت جام کی ہے جو ۴۴۱ھ سے لیکر ۵۲۴ھ تک اس دنیا میں جلوہ افروز تھے۔ یہ تو اردو بذات خود کرامت ہے۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زمانہ میں اردو زبان پاؤں بھی چلنے کے قابل نہیں تھی۔ ایسی ہندی نہ ہوگی جیسی حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے ابتدائی کلام میں پائی جاتی ہے۔ اُردو کا ایک شعر مخدوم پاک کی روحانیت سے اس قدر صاف و سنہرا ہے جو تبرک کے طور پر کیرانوی صاحب نے نقل کیا ہے اور جس پر آج کی ترقی یافتہ اُردو فخر کر سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو

اس طرح اس میں ڈوب لے صابر

کہ بجز ہو کے غیب ہو نہ ہے

حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کا دیوان جو کیرانوی صاحب کو نہ مل سکا تھا۔ ابھی حال ہی میں وہ پاکستان کے زائرین کلیر شریف کے انگلستان پلٹ لیڈر کے ہاتھ آ گیا اور انہوں نے معتقدین صابر صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے استفادہ کے لیے ارمغان صابر کے نام سے شائع کر کے احسان فرمایا ہے۔ عالی جناب ڈاکٹر وجید قریشی صاحب (لاہور)

نے کہ اچھی کے سہ ماہی رسالہ "اردو" بابت اکتوبر ۱۹۶۷ء میں اس 'ارمغان صابر' پر تبصرہ کر کے بڑی خوبی سے دیوان کے شائع کرنے والے پاکستان کے انگلستان پلٹ لیڈر صاحب کو مبارکباد اور داد دی ہے۔ انہوں نے اسی دیوان کے اشعار سے ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ دیوان اس شخص کا ہے جس کا نام مظہر علی یا صابر علی تھا اور تخلص صابر رکھتا تھا۔ یہ صاحب دیوان سلسلہ نظامیہ سے منسلک تھا اس نے اپنے نظامی ہونے پر فخر یہ اشعار بھی لکھے ہیں اور حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت قطب الدین منور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شان میں منقبتیں لکھی ہیں۔ کوئی سخن داں اور صاحب دانش اس دیوان کو حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منسوب نہیں کر سکتا۔ غالباً یہ فیض اس انگلستان پلٹ لیڈر کو حضرت کیرانومی صاحب سے ہی پہنچا ہے۔ اگر دیوان شائع کرنے سے پہلے اس دیوان پر نظر ڈال لیتے تو دیباچہ میں وہ دعویٰ نہ کرتے جو کیا ہے۔ تفویز تو اے چراغ گردان تفویز کیرانومی صاحب کو ان کی تحقیق نے یہ بھی ثابت کیا کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سماع کا بے حد شوق تھا اور صاحب مرآة الاسرار نے ان کا بول بالا کیا ہے کہ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال بھی سماع کی حالت میں ہوا تھا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سماع ہی استغراق کا باعث ہوتا ہے اور یہ بھی غور طلب کہ سوختہ کلیئر میں قوال کہاں سے مہیا ہو جاتے تھے۔ صوفی جانتے ہیں کہ حالت استغراق میں صوت سردی و جدانیت پیدا کرتی ہے۔ سچ پوچھیے تو زمین سے آسمان اور قلب سے روح تک روحانی آواز ہی کی حکمرانی ہے۔ مولانا روم نے اس آواز کے متعلق لکھا ہے۔

خشک چوب و خشک تار و خشک پوست

از کُبابی آید این آوازِ دوست

حضرت مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد ہے کہ سماع کی لذت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک مشاہدہ نہ ہو۔ جب مشاہدہ ہو جاتا ہے تو سماع کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ جب کیراڑی صاحب کی روح پر فتوح کی خدمت میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے۔

اے تو مجموعہ خوبی زکدامت گویم

۱۰۳۹ھ میں داراشکوہ نے سفینۃ الاولیاء تصنیف کی تھی۔ ہمیں حضرت محمد علی

الہ آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے فیض حاصل کرنے کا اقبال کیا ہے اور شجرہ صابری بھی نقل کیا ہے۔

مرآة الاسرار شیخ عبدالرحمن چشتی کی تالیف ہے۔ یہ ۱۰۶۵ھ کی مشہور کتاب ہے اس

میں خصوصیت کے ساتھ لفظ ”بھوگا“ کی تشریح کی ہے یعنی یہ کہ بھوگا حیرت کا مترادف ہے لہذا

تجربہ ذات خود عیش و عشرت ہے اور یہ نعمت تجیر مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حاصل تھی۔

اس لحاظ وہ یقیناً خوش باش تھے۔ ان کی تحقیق ہے کہ بھوگا والی دعا بابا صاحب نے مخدوم

پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ہی دی تھی نہ کہ علی صابر ساکن ڈیکری کو انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ

جب مخدوم علیہ الرحمۃ مستقل طور پر گولڑ کی شاخ پکڑ کر کھڑے ہو گئے تو بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ

علیہ نے انعام کا وعدہ کر کے ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو روانہ کیا کہ کسی طرح انکو بٹھادیں

حضرت ترک خوش الحانی سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے پہنچے تو جلال صابری مغلوب

ہو گیا اور ادباً وہ کھڑے سے بیٹھ گئے۔ اس صلہ میں حضرت ترک کو مخدوم کی خلافت ملی۔ لیکن

خلافت ملنے کا سال ان صاحب نے نہیں لکھا ہے۔ شیخ عبدالرحمن نے کلیئر کی مسجد ڈھلے

کی تاریخ ۱۰۶۵ھ لکھی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ مخدوم پاک کو پہلے دہلی کی ولایت دی گئی

تھی پھر مانسی کے نزاع کے بعد کلیئر کی ولایت تفویض ہوئی تھی۔ یہ شیخ عبدالرحمن چشتی حضرت

تقسیم ہند کے بعد پاکستان کو ہجرت کر گئے ہیں۔ مولانا اکرم شاہ برلاسوی نے روحانی طور پر پھر
مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے نہ صرف فیض حاصل کیا تھا ملاقات کا بھی ثروت حاصل
کیا تھا۔ اب تک مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق جو اختلافی و نزاعی امور تھے۔ انہوں
نے بڑی سادگی و صفائی کے ساتھ طے کر دیئے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ فرمایا ہے کہ سیرالاولیاء
علی صابری ساکن ڈیکری اور مخدوم علامہ الدین علی احمد صابری دو نہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ سیرالاولیاء
کی اصلاح فرمائی ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نہ ساکن ڈیکری تھے اور نہ ان کا کوئی
تعلق حضور غوث پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خاندان سے تھا۔ بلکہ وہ ساکن گنجہ تھے اور
یہودی النسل تھے۔ نزاع ہانسی کی تصدیق و تائید فرمائی ہے کہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ
علیہ کو اسناد کے رد و قبول کا اختیار تھا لیکن اس میں خفیف سی ترمیم کر دی ہے یعنی یہ کہ
جب حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی سند چاک کر
دی تو مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس ماجرے حضرت
بابا صاحب علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ تیر مردان خطا نمی شود۔ ان کا سلسلہ چونکہ اوپر سے منقطع
کیا ہے لہذا آخر سلامت رہا۔ یہ کہہ کر حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی
مجبوری بھی ظاہر کر دی کہ ”دریدۃ جمال را فرید نتوان دوخت“ پھر تسکین کے لیے مخدوم صاحب
سے ارشاد کیا کہ ”خاطر جمع دار و دل تنگ مشو۔ ترا بہتر ازیں کاغذ نوشته دہم کاغذ کا لفظ
استعمال کر کے سند خلافت اور ولایت کی تقرری دہلی کا جھگڑا بھی ختم کر دیا۔ مولانا نے
کلیر کے احوال میں تحریر کیا ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وہاں پہنچتے ہی عبادت
اور فیض رسانی میں مشغول ہو گئے اور بعد وصال بھی ایسا ہی فیض جاری رہا۔ جیسا حیات
میں تھا۔ عبادت کے متعلق لکھا ہے کہ ہمہ وقت محو و مستغرق رہتے تھے۔ اور فیض رسانی

کی تشریح یہ کی ہے کہ مسجد ڈھادی - دبا پھیلا دی اور کلیر کے جنگل میں آگ لگا دی - اس کے بعد جب وصال ہو گیا تو مزار اقدس پر برق جلال تڑپنے لگی جس کی وجہ سے کوئی شخص مزار کے قریب نہیں جاسکتا تھا - مجاور بھی دُور جا کر بس گئے تھے - شیر و غیرہ برق جلال سے ستنے کر دیتے گئے تھے - اور وہی مزار پر اپنی دموں سے جھاڑو دیا کرتے تھے - البتہ ایک سنیاسی کو برق جلال نے مزار پر حاضر ہونے کی اجازت دے دی تھی - اس نے مزار کے اندر کا حال دیکھنے کے لیے مزار میں شکاف و سوراخ کر دیا تھا اور اس کے بعد مزار کی نگرانی اور حفاظت کے لیے مجاور پھر بلا لیے گئے تو برق جلال شرمنا کر رہ گئی - غرض عرصہ دراز کے بعد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کلیر جا کر الحاح و زاری کی تو حاضری کی اجازت ملی لیکن پھر بھی برق جلال تین مرتبہ مانع آئی اور ان کی آستیں کا کچھ حصہ بھلس دیا - چنانچہ مشہور ہے کہ حضرت شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اولاد کی ایک آستین کتنی ہی صحیح بنائی جلتے مگر خود بخود چھوٹی ہو جاتی ہے - واللہ اعلم - قبر سے باہر نکل کر حضرت شیخ سے مخدوم پاک بغل گیر ہوئے اور ان کی درخواست پر برق جلال کو تنزیہ کے غلاف میں ہمیشہ کے لیے چھپا لیا -

مولانا اکرم شاہ پہلے شخص ہیں جنہیں صابری جلال کی توجیہ کرنے کا فخر حاصل ہے - یعنی یہ کہ مخدوم پاک کی ولایت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے نقش قدم پر ہے - چونکہ موسیٰ علیہ السلام صاحب جلال تھے اس لیے یہ بھی جلالی ہوئے - اور یہ کہ حضرت کے جلالی تصرفات کی وجہ سے دوستوں کی عقیدت بڑھی اور دشمنوں کے دل تھسرا گئے - اقتباس اٹلانوار کی عزت و عظمت کا سبب بقول مولانا اکرم یہ ہے کہ جب یہ کتاب ختم ہونے کو آئی تو خواب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم - چاروں اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ

عہم اور دیگر اولیائے نامدار کی معیت میں جلوہ افروز ہوتے ان میں غوث پاک، خواجہ غریب نواز
 حضرت گنج شکر، قطب عالم، شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور حضرت شیخ صاحب صادق رحمۃ اللہ
 علیہم اجمعین شامل تھے۔ شیخ محمد صادق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے میری کتاب حضور نبوی (صلی اللہ
 تعالیٰ علیہ وسلم) میں پیش کی۔ ارشاد ہوا کہ بہت عمدہ کتاب ہے ہم نے اسے قبول کیا اور
 فاتحہ پڑھ کر ایک چادر نور انضر کی مجھے مرحمت فرمائی۔ سب بزرگوں نے کتاب کو ملاحظہ
 فرمایا اور سب نے مجھے مبارکباد دی۔ خواب سے بیدار ہوا تو میرے بستر سے مشکِ عنبر
 کی خوشبو آ رہی تھی۔ حیرت ہے کہ متذکرہ بالا بزرگوں میں حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ
 علیہ انہیں کیوں نہیں دکھائی دیتے۔

پتہ نہیں کہ تذکرۃ الاتقیاء کب لکھی گئی اور کس کی طبع زاد ہے۔ تاریخ فرشتہ جلد
 دویم کے بمبئی ایڈیشن کے صفحہ ۷۲۹ پر اس کتاب کے حوالے سے مندرجہ ذیل روایت مسطور ہے
 کہ ”شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں تین شخص نظام الدین نام کے
 موجود تھے۔ ایک خود ان کے بیٹے دوسرے ان کے بھانجے اور تیسرے سید نظام الدین
 اولیاء بدایونی“ بابا صاحب نے اپنی ہمیشہ کے کہنے سے مجبور ہو کر اپنے بھانجے نظام الدین
 کو خلافت و سجادگی کی مثال لکھ دی تھی۔ وہ مہر لگوانے ہانسی گئے۔ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
 نے مہر لگانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے اصرار کر کے بھائی سے دوسری
 سند لکھوا دی۔ جب سند لے کر دوبارہ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں حاضر
 ہوئے تو انہوں نے وہ مثال چاک کر دی۔ عرصہ کے بعد جب بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ
 علیہ نے سید نظام الدین اولیاء بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو خلافت نامہ لے کر بھیجا تو شیخ جمال رحمۃ اللہ نے اسکی توثیق کر دی“ اس روایت سے
 معلوم ہوتا ہے کہ شیخ جمال رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت کے بھانجے نظام الدین کی سند چاک کی تھی اور نزاع کی کہانی ان ہی سے تعلق رکھتی ہے

اس نزاع کا بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بھانجے علامہ الدین علی احمد صابر سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اب تذکرہ نویس اور معتقدین خود فیصلہ کریں کہ ہانسی کا نزاع بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے کون سے بھانجے سے ہوا تھا۔ مخدوم علی احمد صابر کو خلافت ۱۲۶۶ھ میں ان کی والدہ بی بی ہاجرہ کے وصال کے بہت بعد از خود دی تھی۔ نتیجہ کھلا ہوا یہی نکلتا ہے کہ نزاع بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بھانجے نظام الدین ہی سے ہوا تھا۔ لیکن عقل حیران ہے کہ بی بی ہاجرہ کے علاوہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دوسری ہمیشہ کہاں سے آگئیں۔ دوسری ہمیشہ کے متعلق نہ کوئی خاندانی روایت ہے اور نہ تاریخ سے شہادت ملتی ہے۔ لہذا ان دوسرے بھانجے نظام الدین کا نمودار ہو جانا تعجبات سے ہے۔

مندرجہ بالا تذکروں کے علاوہ اور بھی تذکرہ جات ہیں جن کے نام بتا دینا ہی کافی ہیں۔ ان سب تذکروں میں اسی قسم کی بے سرو پا روایتیں ہیں۔ البتہ خزینۃ الاصفیاء میں علی صابر اور مخدوم علی احمد صابر کے سوانح علیحدہ علیحدہ درج ہیں۔ علی صابر کا انتقال اس میں ۱۲۶۹ھ اور مخدوم علیہ الرحمۃ کا وصال ۱۲۹۰ھ میں لکھا ہے۔ (فہرست تذکرہ صاحب ذیل ہے)

انوار العاشقین ○ ماثر الکلام ○ مناقب احمدیہ و مقامات سعیدیہ -
 (۱۲۸۸ھ) حقائق فاؤدی ○ ثمرۃ القوائد ○ چہار گلشن - سیر المتأخرین ○ ذخیرہ
 خوارزم شاہی ○ آرائش محفل ○ کھر زخار ○ طبقات حامی ○ مجمع المعارف ○ نوادر السفر
 قصر عارفان - مرآة الضیائی ○ گلشن اولیاء ○ اسرار الاخبار ○ آئین اکبری ○
 تاریخ ہفت اقلیم وغیرہ - ○

اس میں حضرت عبدالاحد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بیان میں مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ذکر

آگیا ہے۔ یہ نقشبندی حضرات کا تذکرہ ہے۔

دو تذکرے اور ہیں جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے سب سے جدا ہیں۔ ان دونوں کی بنیاد و کشف و الہام پر ہے۔ ایک "گلزار حقیقت صابری" ہے اور دوسرے کا نام "اسرار عترت فریدی" ہے۔ ماوراءالعقل ہونے کی وجہ سے یہ دونوں قابلِ توجہ ہیں۔ ان میں روایات کا حوالہ بزرگوں کی روحانی مکتوباتِ نطاب سے دیا گیا ہے جن کا وجود عالم ظاہر میں نہیں ہے۔ ان کی تشریح سوائے صاحبانِ کیفیت کے ممنوع ہے اس لیے مخفی رکھی گئی ہے۔ مگر ظاہری معیار پر دیکھا جائے تو ان دونوں کے الہامی بیانات میں تناقص ہے۔ "گلزار حقیقت صابری" حضرت بادشاہ دو جہاں مخدوم شاہ محمد حسن چشتی قدوسی۔ معشوقِ الہی رحمۃ اللہ علیہ کے الہامات کا مجموعہ ہے۔ اس کی تکمیل ۱۳۰۸ھ میں ہوئی تھی۔ انہوں نے روحانی صورت سے مخدوم پاک کی زیادت ثابت کی ہے۔

ہانسی کے نزاع کے متعلق ان کا الہام خاموش ہے۔ اس کتاب کے متعلق صوفی محمد جان صابری مراد آبادی نے جو حضرت محمد حسین مراد آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ ہیں اور جو ان بادشاہ دو جہاں معشوقِ الہی کے ہم عصر ہیں اپنی رائے اپنی تصنیف "قول فیصل" میں لکھی ہے کہ "اس کا فقرہ فقرہ برباد کنندہ ایمان ہے اور اس کے مصنف نئی طریقت اور نئی شریعت کے مدعی ہیں کیونکہ وہ منکر بدیہات اور مخالف اجماع ہیں"

دوسرے بادشاہ دو جہاں حضرت محمد حسین فریدی ابو دھنی ہیں۔ یہ معشوقِ الہی رامپوری کے خلیفہ اعظم ہیں۔ اپنے شیخ کامل کے حکم سے بزرخ بدل کر انہوں نے اسرار عترت فریدی ۱۳۰۸ھ میں مرتب کی تھی۔ یہ صاحب اولیاء اللہ کے روحانی کتب خانوں کے نائب محافظ دفتر بھی تھے انہوں نے اپنی روحانیت سے ہانسی کے نزاع سے ہر ممکن طریقے سے انکار کیا ہے۔ ان کی یہ زبردست تصنیف اس لیے بھی لائقِ شکر یہ ہے کہ انہوں نے

بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اہلیہ اول کا نام و نشان بتا کر بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ازواج کا سلسلہ مربوط کر دیا ہے۔ بہر حال کمال و کرامت یہ ہے کہ مرشد اور خلیفہ کے ہاتھ میں نمایاں فرق ہے اور ان کے اختلافات کو ان کے معتقدین رحمت سمجھتے ہیں۔

اسی زمانہ میں پیر جی خلیل الرحمن سرسادی نے اپنے آپ کو جمالی خاندان کا فرد ہونے کا دعویٰ کر کے سلسلہ جمالی کی تجدید کا اعلان کیا تھا اور نزاع ہانسی کی بنیاد پر حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی توہین و تذلیل کی تھی۔ جمالی سلسلہ کو زندہ کرنے کے لیے انہوں نے الٹی گنگا بہانی ہے اور مخدوم پر اعتراضوں کی بھرمار کی ہے کیونکہ بغیر اس قسم کی مخالفت کے ان کی گاڑی چل نہیں سکتی تھی۔ صابریوں سے بڑی طویل بحث اور روح فرسا مجادلوں کے بعد یہ طے پایا کہ دونوں فریق اپنے دعووں کو دیوان صاحب اجمیر کے سامنے ۱۳۱۳ھ کے عرس کے ایام میں پیش کریں اور فیصلہ کروالیں۔ مگر تاریخ مقررہ پر باوجود تقاضوں کے پیر جی خلیل الرحمن حاضر نہیں ہوئے۔ لہذا دیوان صاحب اور متولی صاحب نے پیر جی خلیل الرحمن کو "مجالس غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور چشتی خانقاہوں میں شرکت سے محروم کر دیا جب تک کہ اپنی گستاخیوں اور بدکلامیوں سے توبہ نہ کریں" آخر کار ۱۳۱۳ھ کے عرس میں چشتی خانقاہوں کے جملہ سجادہ نشینوں نے یہ رائے دی کہ "کوئی فریق کسی کے بزرگ کی توہین نہیں کرے گا" جب ان سب سجادہ نشینوں کا انتقال ہو گیا تو ۱۳۲۲ھ میں پیر جی نے ایک کتاب تصنیف کی اور دس سال بعد ۱۳۳۲ھ میں اس کتاب کی ایک ہزار جلدیں امرتسر میں چھپوائیں۔ اور شائع کیں اس کرامت کے ساتھ کہ صابریوں کو خبر نہ ہونے پائی۔ اس کتاب کا نام "آئینہ حق نما" ہے۔ پیر جی کے معتقدین اس کرامت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ صابریوں نے خلاف معاہدہ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی مگر اس چھیڑ چھاڑ کا وجود و ثبوت کہیں نہیں ہے۔ اب یہ کتاب صرف

چند مریدوں کے پاس رہ گئی ہے اور وہ بہ صیغہ راز اس شرط پر لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ کسی سے تذکرہ نہیں کریں گے تاکہ انہیں معاہدہ کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار نہ دیا جائے۔

بہر حال تشریح جو کی گئی ہے اس سے تذکرہ نویسوں کے معیار مذاق اور

علم کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان فضول روایتوں کی بنیاد اس تحریف پر ہے جو

سیرالاولیاء میں کی گئی ہے۔ اس زمانہ کا ماحول کچھ ایسا ہی ویسا تھا۔ اس عہد میں روایتی

ایک طرح سے پیشہ بن گئی تھی۔ لہذا مخدوم پاک کے یہ جملہ تذکراتے از قسم ضغاث الاعلام

ہیں۔ - تذکرہ نگار باوجود صاحب علم ہونے کے ماحول کے اثرات سے

مرعوب ہو گئے تھے۔ اس تشریح کے بعد اب بھی کسی کو پس و پیش ہو تو مجبوری

ہے۔ ضد اور ہٹ دھرمی کا علاج لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ کوئی

کسی کو سمجھ عطا نہیں کر سکتا۔

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو

نہ لاتے تاب جو غم کی وہ اپنا راز داں کیوں ہو

خُلاصہ

- ① یہ سب ۴۵ تذکرے ناقابل اعتبار ہیں۔
- ② منکرین کا انکار معتقدین کی خوش عقیدہ کی وجہ سے ہے۔
- ③ جمالیوں کے اعتراض مغالطہ خیز ہیں اور ان میں روحانیت کی کوئی بات نہیں ہے۔
- ④ جمالی سلسلہ شروع ہی سے نہیں چلا۔ لہذا اس کے اجراء کی کوشش فضول کی گئی۔
- ⑤ حضرت جمال رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اولاد سلسلہ نظامیہ سے منسلک ہوئی اور ہے۔
- ⑥ تذکرہ نگاروں نے جلال و جمال میں امتیاز نہ کر سکنے کی وجہ سے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تعارف غلط اور خلاف شان لکھا ہے۔

صابری تعلیم

بظاہر کچھ نہیں کہتے مگر ارشاد ہوتا ہے

ہم اس کے ہیں جو ہم پر ہر طرح برباد ہوتا ہے

روحی فداہ حضرت یسید لولاک صلوٰۃ اللہ علیہ کی مستند حدیث ہے کہ ”انسان کے

جسم میں ایک ایسا عضو ہے جس کے صالح ہونے سے سارا جسم صالح ہو جاتا ہے اور جس

کے خراب ہونے سے سارا جسم خراب ہو جاتا ہے اور وہ عضو دل ہے“ مطلب یہ ہوا کہ جیسا

دل ہوگا ویسا ہی جسم ہوگا۔ دل اور جسم کی نورانیت روح کی تقویت کا باعث ہوتی ہے روح

کو فنا نہیں۔ موت صرف جسم کو آیا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آدمی خاک اور روح سے مرکب ہے

مرحلے والے نورانی جسم کا مدفن بھی نورانی ہو جاتا ہے۔ لہذا صالحین کے

قرب و جوار میں دفن ہونے والوں کو ان کی نورانیت سے فائدہ پہنچتا ہے۔ گویا مرحوم اہل اللہ

کے جسم و روح دونوں فیض رساں ہیں۔ شہیدوں اور ولیوں کو مردہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ انہیں

دربار الہی سے روزی ملا کرتی ہے۔ ان کا جسم سڑنے اور گلنے سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ انوار

الہی مثل صورت آفتاب و مہتاب کائنات کے ذرے ذرے پر ضو فگن ہیں۔ لیکن آنکھ دیکھنے

کی تاب نہیں لاسکتی۔ انوار الہی کے ملاحظہ کے لیے ایک عینک کی ضرورت ہے۔ ان

کی دید بغیر توسل و توسط کے ممکن نہیں۔ بہ منہ بنگرم جلوۂ آفتاب۔ صوفیوں میں شیخ کی برزخ توسل عینک کا کام کیا کرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ رب العالمین کی حضوری حاصل کرنے کا ذریعہ حضور قلب ہے اور حضور قلب بغیر شیخ کی تعلیم و محبت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ شیخ کی محبت ہی اراد کی محبت کا طریقہ سکھاتی ہے اور حیات میں تازگی و بالیدگی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔

حضور قلب کی تعلیم ہر مذہب میں ہے لیکن اسلام میں سب سے بہتر اور سہل الحصول ہے۔ شریعت میں نماز۔ روزہ۔ حج و جہاد کی تعلیم ہے اور طریقت میں شریعت کی پابندیوں کے ساتھ ذکر و فکر کی تاکید ہے اور ذکر و فکر ہی سے حضور قلب حاصل ہوتا ہے تصور شیخ کو بدرقہ راہ بنایا گیا ہے۔ صوفیوں کے سب سلسلے و طریقے تصور شیخ کے قائل ہیں مگر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ باوجود علم و فضل کے مولانا اشرف علی تھانوی نے قصص الاکابر کے صفحہ ۲۲ پر کیسے لکھ دیا کہ چشتیوں میں تصور شیخ نہیں ہے۔ ان کے برخلاف مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب نے ارواح ثلاثہ کے صفحہ ۳۹۰ پر لکھا ہے کہ تین سال کامل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا چہرہ قلب میں رہا اور میں نے بغیر اس سے پوچھے ہوئے کوئی کام نہیں کیا۔ حضور قلب کی تکمیل محض نظر فکر اور گمان سے ہی نہیں ہوتی بلکہ کشف و شہود یقین سے بھی ہوتی ہے اور اس کے حصول کے لیے خلوص و محبت یعنی لہیت اصل شے ہے۔ شریعت و طریقت دونوں میں حضور قلب کی تعلیم ہے مگر دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ اسلام نیت کی درستی کو ضروری سمجھتا ہے اور قول و عمل میں یکسانیت چاہتا ہے۔ علم کا مقصد عمل ہے اور صحیح عمل دل کی درستی پر موقوف ہے۔ صالح دل کی علامت یہ ہے کہ آدمی راضی بہ رضا ہو۔ صحیح مقصد کے لیے کوشش کرنا ہمارا کام ہے مگر نتیجہ اللہ کے اختیار میں ہے اپنی جدوجہد کے نتیجہ سے بے نیاز ہو جانے کے بعد ہی طاعت و عبادت میں ذوق پیدا

ہوتا ہے شریعت میں نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج اُمّ المجاہدات ہیں۔ ان سب کی تکمیل دل کو دل بنا دیتی ہے۔ درجہ نفس کو طے کر لینے کے بعد مرتبہ قلب میں داخلہ ہوتا ہے اور طریقت کے حدود شروع ہو جاتے ہیں بہر حال اس طرح شرعی تعلیم کو حضور قلب کے ذریعہ کمال پر پہنچایا جاتا ہے۔ جس طرح شریعت نیت کی درستی کا انتظام کرتی ہے اسی طرح طریقت باطنی احساسات کو صحیح بناتی ہے۔ طریقت والے کسی نئی تعلیم کے مدعی نہیں ہیں۔ البتہ شریعت کی ترویج و تکمیل کے لیے حُسن و خوبی سے نئی سمجھ اور نیا طریقہ پیش کرتے ہیں۔ طریقت کو شریعت سے جدا سمجھنا نا سمجھی کی دلیل ہے۔ شریعت اور طریقت میں جسم و روح کا تعلق ہے۔ شریعت بغیر طریقت کے ایک خوشنما پھول ہے جس میں خوشبو نہ ہو۔ اور طریقت کو بغیر شریعت کے ایسا ٹغمہ تصور کرنا چاہیے جس میں سُرنہ ہو اور بے آہنگ ہو۔

طریقت کے جملہ سلسلوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ یعنی معرفت الہی لیکن مختلف طبقوں کی وجہ سے حصول مقصد کے طور و طریقے میں خفیف سا فرق ہے۔ چنانچہ سلسلہ چشتیہ کی بھی ایک امتیازی خصوصیت ہے اس کا اندازہ تعلیم چشتیہ کے معمولات سے کیا جاسکتا ہے اس کی تعلیم درسی نہیں ہے۔ حضرت عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نفس کی مخالفت چشتیوں میں عبادت کی جان ہے اور عام رسم و راہ پھنسنے رہنا ان کے یہاں کفر ہے چشتی نفس کو صنمِ اکبر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے یہ اصول قرآن پاک سے اخذ کیا ہے۔ چشتی مجاہدات کے ذریعہ تصفیہ و تزکیہ کر کے دماغ کو صاف کیا کرتے ہیں۔ پھر قلب پر صیقل کر کے نقوش بتاتے ہیں۔

۱۔ سید اکبر حسین ریٹائرڈ جج الہ آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے معرفت کی تعریف پر لطف لکھی ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

۲۔ سورۃ نازعات کی آیات نمبر ۴۳ و ۴۴ ملاحظہ ہوں۔

ان نقوش کو صفات و ملکات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تزکیہ و تصفیہ میں شیخ کی توجہ کے علاوہ
 و وظائف بھی ہوتے ہیں مگر اصل تکمیل محبت بھری آہ سوزاں سے ہوتی ہے۔ محبت ہی عزم
 کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو پہچان لینے کے بعد خدا کی معرفت کا شعور پیدا ہو جاتا
 ہے۔ چشتی محبت ہی کی خاطر نفس کی مخالفت کر کے اسے مہذب بنا لیتے ہیں تہذیب نفس اور
 محبت کا تقاضا ہے کہ اچھے بُرے سب کے ساتھ اخلاق برتا جائے۔ ہر شے نیک و بد پہلو رکھتی
 ہے۔ نیک تو نیک ہوتا ہی ہے مگر بد کو نیک بنا لینا کمال بندگی ہے۔ حضرت سلطان المشائخ رحمہ اللہ
 تعالیٰ علیہ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”در صحبت با باش یا ما در صحبت تو باشیم“ بد کو نیک بنانے کی یہی
 بہترین صورت ہے۔ اس سے اتحاد بڑھتا ہے اور توحید کی تبلیغ ہوتی ہے۔ بہر حال چشتی نفس کی مخالفت
 کر کے صبر و رضا کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نشانی ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوانہ
 چشتیوں میں محبت و ہم نشینی کے ساتھ اتباع و تقلید ضروری ہے لیکن وہ ارباب ظن و تخمین کی
 تقلید کو حرام سمجھتے ہیں۔ تجدید کے وہ معترف ہیں مگر تائیس کے قائل نہیں ہیں۔ حق یہی ہے کہ پرانی
 عمارت کو ڈھا کر از سر نو عمارت بنانا طول اٹل ہے اور اسراف بھی ہے۔ پرانی عمارت کو مفید و
 کار آمد بنانے کے لیے حسب ضرورت ترمیم کر دینے کو تجدید کہتے ہیں۔

خواجگانِ چشت کے معمولات۔ حالات اور واقعات سے ظاہر ہے کہ وہ مریدوں

اور خلفاء سے چکی پسوانے کے بجائے شریعت کی پابندی کے ساتھ اپنی
 قلبی توجہ سے قلبی احساسات کو درست کرتے ہیں اور روزانہ زندگی میں ہر
 طرح نفس کی آزمائش و اصلاح کرتے ہیں۔ تدبیر، تفکر، اجتہاد و تحسس کے طریقے
 سکھاتے ہیں تاکہ اخلاق الہی حاصل کئے جاسکیں۔ خواجہ بزرگ حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۷۔ ۷۸۔ سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مولفہ احقر ہیں اسکی
 تفصیل تعلیم چشتیہ وائے باب میں ملاحظہ ہو۔

کی ظاہری حیات میں جذبہ وسلوک دونوں پائے جاتے ہیں مگر سلوک کا غلبہ ہے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں جذبہ کی کسی قدر زیادتی ہے۔ انہوں نے حضرت خضر رومی قلندر رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت کا تبادلہ کیا تھا۔ اپنا سلوک انہیں دیا اور ان کا جذبہ خود لیا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں جذبہ سلوک کی مساوات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے چشتی تعلیم کی تبلیغ سے سلسلہ کو بام ترقی پہنچایا۔ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں مجذوبیت کی از حد زیادتی ہے اور حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں سلوک کی خوشگوار بہا رہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب ہندوستان میں فتنہ و فساد کی لہر دوڑی تو مذہب میں بھی تحریف ہوئی۔ اخلاق بگڑ گئے اور فرعونیت شروع ہوئی اور طبیعتیں ذلت و پستی کی طرف مائل ہوئیں تو حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے رفاہ عام کے لیے جذبہ وسلوک کو علیحدہ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو مجذوب ساک کے درجہ میں خلافت عطا فرمائی اور حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ساک کامل اور رئیس فقیر کا مرتبہ دے کر خلیفہ بنایا۔ گویا اس طرح چشتیہ سلسلہ کی دو شاخیں ہو گئیں۔ اصل یہ ہے کہ اس زمانہ کی کمزور طبیعتیں جذبہ وسلوک دونوں کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اجتہاد ہے کہ نہایت خوبی سے سلوک و جذبہ کو علیحدہ کر دیا۔ وصال سے پہلے جو ارشاد فرمایا تھا وہ مختلف نوعیتوں سے اہمیت رکھتا ہے۔ قرمبایا کہ ”علم سنیہ من بہ شیخ نظام الدین بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رسید و علم دل من بہ شیخ علامہ الدین علی احمد فائزہ گردید“ ظاہر ہے کہ دل سینہ کے اندر ہوتا ہے۔ لہذا علم دل خفی و رخصی ہوا۔ اس لیے مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنا نمونہ آپ ہیں۔ عناصر میں جو مرتبہ با دیا ہوا کا ہے وہی درجہ روحانیت میں

مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی تعلیم از دل خیز و بے دل ریزہ
 طرح کی ہے۔ وہ ظاہر سے بے نیاز رہے مگر ان کا سلسلہ آب و تاب سے چلا۔ یہی حقیقت لوگوں
 کو حیران کئے ہوئے ہے۔ اسی حیرت کی وجہ سے کچھ لوگ ان کے وجود تک کے متکرہ ہو
 معتقدین نے معاندین کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنے انکار سے نہیں ہٹے۔ مخدوم
 پاک رحمۃ اللہ علیہ کے وجود کا ثبوت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مندرجہ بالا
 سینہ و دل لے ارشاد میں بھی موجود ہے۔ یعنی حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان
 پورا نام دیا ہے تاکہ اس کا انطباق کسی اور پر نہ ہو سکے۔ حضرت سلطان المشائخ کی تعلیم اور
 ان کے سلسلہ کی تبلیغ جس طرح ہوئی وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ مگر حضرت صابر علیہ الرحمۃ کی
 تعلیم و تبلیغ قلبی ہونے کی وجہ سے چشم ظاہر سے اوجھل رہی۔

بتایا گیا ہے کہ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ گیارہ سال کی عمر میں گوشہ سعادت
 میں بٹھا دیئے گئے تھے اور اکیس سال بعد ان کو خلافت دی گئی تھی۔ لیکن ان کی باطنی تعلیم
 کی تفصیل نہیں بتائی گئی ہے کشفی تذکرہ کا بیان ہے کہ دوران عزت میں شغل نوری کی مشق
 کروائی گئی تھی۔ خواجگان چشت مرید کو حسب مراد بنانے کے لیے ابتداء میں کچھ مجاہدے بھی
 کرواتے ہیں۔ پھر اپنی توجہ سے اے کامل بنا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مرید عالم تجلیات میں محو
 ہو جاتا ہے۔ اسی اصول پر مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو تین سال ظاہری تعلیم دی پھر
 گوشہ میں بٹھا کر صفات و ملکات کے جلووں سے آشنا کیا۔ اس طرح ذات و نفس پر عبور کروانے
 اجتہاد و تجسس کے ذریعہ انابت الہی کی اہلیت پیدا کر دی۔ حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ
 علیہ کا ارشاد ہے کہ شیخ میں اس قدر دل کی قوت اور ضمیر کی صحت ہونا چاہیے کہ جس کو مرید
 کرے اس کے سینہ کی زنگار اپنی قوت باطن سے صیقل کر دے اور راز ہائے فطرت سے

آگاہی دیدے جب مرید میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ شخصی و کائناتی زندگی کے مضمون کو اشاروں اشاروں میں سمجھ لیا کرتا ہے اور گفت و شنید کی اسے ضرورت نہیں رہتی مختصر یہ کہ حضور قلب کا کمال اسے حضوری کا اہل بنا دیتا ہے۔ یہ کمال بغیر شیخ کی محبت و توجہ کے حاصل نہیں ہو کرتا۔ خواہ ذاتی طور پر کتنے ہی مجاہدات کئے جائیں۔ مگر فضل الہی کی اور بات ہے جسے چاہے اور جس وقت چاہے آنکھ جھپکتے ہیں سرفراز فرما دے۔

جب مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کو روحانی تعلیم خاص طور پر اس طرح پر دی گئی ہے تو ان کی خلافت اور تبلیغ کا طرز دیگر خلفاء سے مختلف بھی ہونا چاہیے اور یہی ان کی تعلیم و تبلیغ میں ندرت ہے ان کی تعلیم چونکہ قلبی تھی لہذا عقل کی اس تک رسائی نہیں ہو سکی۔ اور جب ظاہری عقل و منطق سے اسے سمجھا تو نتیجہ صحیح نہیں نکلا۔ ان کے یہاں محض توجہ و جذب سے کام لیا جاتا ہے۔ اور کیفیت جذب میں اختیار نہیں ہو کرتا۔ می بڑوہر جا کہ خاطر خواہ اوست۔

علم و عمل ایک دوسرے سے متعلق ہیں اور نسبت لزوم رکھتے ہیں۔ اب اگر ان دونوں میں سے ایک جز پوشیدہ ہو تو دوسرے ظاہری جز سے اس پوشیدہ جز کا قیاس کیا جاسکتا ہے چنانچہ مشہور ہے عشق من پیدا و مشوقم نہاں۔ مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم کو راز ہی کہنا چاہیے مگر نتیجہ اظہر من الشمس ہے۔ ان کی تعلیم تسخیر کائب لیا ہی ہے کہ =

خوبش را صافی کن از اوصاف خود

تا بہ بینی ذات پاک و صاف خود

مُخْلِصَةٌ

- ① طریقت میں حضور قلب کی اہمیت ہے اسی لحاظ سے تصور کی عام زندگی میں بھی بغیر نیت و تصور کے عزم و ارادہ کا امکان نہیں ہو سکتا۔
- ② پیشی مشائخ مریدوں کو اپنی صحبت میں رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ تربیت صحیح ہو سکے۔
- ③ مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیم قلبی و باطنی تھی اور اس کی بنا پر محبت و خلوص پر تھی۔
- ④ صابریوں میں شیخ کامل اپنی توجہ سے مراتب طے کروا دیتا ہے۔
- ⑤ صابری سلسلہ میں مجاہدات برائے نام ہیں اور جذبہ کی کار فرمائی زیادہ ہے۔
- ⑥ صابری مشائخ بجائے پند و نصائح کے نظر سے حقیقت آشنا کیا کرتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حق

حق

حق

صَابِرِی سلسلہ

ایں شانہ ہمہ آفتاب است

بعض معاندین کا گمان ہے کہ جس کو صابری سلسلہ کہا جاتا ہے وہ شمسی سلسلہ ہے مگر یہ قطعی غلط ہے۔ نہ حضرت شمس الدین ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کبھی ایسا دعویٰ کیا اور نہ ان کے متبعین نے اس قسم کا کہیں اعلان کیا۔ حضرت ترک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ علیہ کے تنہا اور واحد خلیفہ تھے اور وہ اپنے شیخ کی ہُو بہُو تصویر تھے۔ استغراق کی وجہ سے وہ بھی دنیا سے بے نیاز رہے۔ اور اسی کیفیت میں انہوں نے صابری سلسلہ کی اشاعت بھی کی سوانح نویسوں کا عجیب مذاق ہے کہ صابری سلسلہ و تعلیم کا تعارف کرانے کے بجائے حقائق کو نظر انداز کر کے اپنے قلم کو قصص عجیبہ حکایات غریبہ اور نوادروا مثال کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ یہ ذہنیت انہوں نے غیر اسلامی عقیدوں۔ قدیم حکایتوں اور اسرائیلی روایتوں سے اخذ کی ہے۔ حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قیام کلیر میں ۶۲۶ھ ۱۲۳۸ء سے ۶۷۹ھ تک تینتیس سال رہا ہے وہاں انہوں نے اس مدت ولایت و خلافت دونوں کے فرائض اپنے مخصوص طرز میں ادا کیئے۔ ولایت کے انتظام باطنی ہوتے ہیں جن کے متعلق اہل ظاہر کو کچھ علم نہیں ہوا کرتا۔ اس علم کو حاصل کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیجے گئے تھے اس کے علاوہ یہ بھی کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ صاحب

ولایت کا انتخاب کس طرح ہوتا ہے۔ مگر صاحب ولایت کے برخلاف خلیفہ کا فرض تبلیغ و اشاعت سلسلہ کے متعلق ظاہری ہوتا ہے۔ جن خلفا کو ولایت کا درجہ نہیں ہوتا ممکن ہے کہ وہ روحانی طور پر صاحبان ولایت سے کچھ معلومات حاصل کرتے ہوں۔ خلیفہ سلسلہ و تعلیم کے قیام و ترقی کا انتظام اپنے ماحول و زمانہ کے لحاظ سے کیا کرتا ہے ۶۶۹ھ کے بعد حضرت ترک پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے پچیس سال اور ان کے خلیفہ حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء نے اُنچاس برس فرائض خلافت اپنے مخصوص طرز سے ادا کئے۔ پھر کبیر الاولیاء کے خلیفہ حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق ردو لوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۶۶۵ھ سے ۸۳۶ھ تک ردو لوی کو مرکز بنا کر نئی شان سے سلسلہ کی خدمت و توسیع کی۔ ان بزرگوں کی عظمت کرامتوں سے اس قدر ظاہر نہیں ہوئی جس قدر ان کے عملی کارناموں سے اس کا اظہار کا ہوا۔ محض کرامتیں ہی بزرگی کا معیار نہیں ہیں۔ دراصل ان حضرات کے کارناموں کو ان کے عہد و زمانہ کی روشنی میں ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے کمالات کی عظمت و وقعت کے متعلق صحیح رائے قائم کی جاسکے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا ہے کہ عہد تعلق میں علمی معیار گر گئے تھے۔ لیکن حالات مظہر ہیں کہ اس عہد میں نامی گرامی علماء موجود تھے۔ ان ہی میں حضرت شہاب الدین میہمرہ اور ان کے شاگرد و خلیفہ حضرت ضیاء الدین نخشبی بھی تھے۔ فیروز شاہ کے مدرسہ کا مشرق کی اعلیٰ درس گاہوں میں شمار تھا۔ مگر بیاں ہمہ حالات اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ ترقی کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ فیروز شاہ نے خود بھی اس حقیقت کا اعتراف و اعلان کیا ہے۔ مورخین کا متفقہ بیان ہے کہ فیروز تعلق ۶۹۰ھ کے وقت سے باہر کی آمد (۹۲۹ھ) تک زمانہ پر آشوب تھا، اقدار و معیار بدل گئے تھے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں تغیر و انحطاط واقع ہو گیا تھا۔ اور مذہبی عقائد میں عجیب ابتدال نمایاں ہوا تھا۔ رسوائی و ذلت کے اس تلاطم میں علماء و مشائخ بچ سکے اور نہ عباد و زہاد۔ فیروز شاہ

عہد میں سب سے پہلے معقولات کی ترویج ہوتی مگر ذہنی انحطاط اپنی جگہ باقی رہا اور مذہب کی گت بنی سکندر لودھی کے عہد میں دو بھائی شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ ناکان ملتان، دہلی میں آئے تھے۔ ان دونوں کے استاد سماع الدین تھے جو میر شریف جرجانی کے شاگرد تھے سماع اللہ نے دہلی سے منتقل ہو کر تھنبور علاقہ جے پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ سکندر لودھی نے تعلیم دہلی کے لیے شیخ عبداللہ کو دہلی میں اور شیخ عزیز اللہ کو سہل میں متعین کیا تھا۔ اس زمانہ میں صابریوں کی باطنی و قلبی تعلیم حسب معمول چلتی رہی۔ نظامیوں کے چلے جانے کے باعث شمالی ہند بظاہر پختی تعلیم سے محروم ہو گیا تھا۔ ظاہری علوم کی ترویج اقتصادی بد حالی اور آئے دن کے مصائب مذہب سے بے اعتنائی کا باعث ہوئے ایسی حالت میں حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق ردوی نے ضروری سمجھا کہ خلوت سے نکل کر جلوت کو رونق بخشیں اور صابری تعلیم کی ظاہری طور پر تبلیغ فرمائیں۔ اس طرح انہوں نے حال کے ساتھ قال کو بھی شامل کر لیا۔ صابری خلفائے وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ردوی میں پہلی مرتبہ صابری خانقاہ بنائی۔ زبردست لنگہ جاری کیا۔ اور غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اصول پر پہلے شریعت پر عمل کرنے کی تاکید کی پھر طریقت کے اصول سکھائے۔ اس طرح ظاہری و باطنی طور پر حق کی اشاعت کر کے صابری سلسلہ کو مقبول بنایا۔ چونکہ انہوں نے سلسلہ کی تعلیم و تبلیغ میں تجدید فرمائی ہے۔ لہذا صابری سلسلہ کے مجدد دراصل وہی ہیں۔ ان کے مُرشد حضرت کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر اسم حق جاری کیا۔ انہوں نے ہی شیخ العالم ردوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نام "عبدالحق" رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں "حق" اسم اعظم بن گیا۔ ان کے حلقہ والے اب بھی اسی اسم کا ورد کیا کرتے ہیں۔ دُور شکل میں قلب صنوبری کی لوح پر اس کا

لہ قلب صنوبری بایں طرف پستان سے دو انگلی نیچے ہے۔

نقش بناتے ہیں۔ حق کی تعریف یہی ہے کہ ثابت و قائم رہے۔ اسم حق دراصل شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیم کا عطر و خلاصہ ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ حق اپنے مختلف رنگوں میں ہر جگہ جلوہ افروز ہے۔ اس کے ماسواہ سب باطل و فانی ہے جس نے حق کو سمجھ لیا وہ دلائل و براہین کو پلے چوہیں سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ اس کے سامنے علم معقول شرمندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظن و تخمین کی ضرورت اسی وقت ہوتی ہے جب کہ حق نظر سے اوجھل ہو، صوفی جانتے ہیں کہ مجاہدہ بغیر مشاہدہ کے فعل عبث ہے۔ یہ ورد و وظائف اور اشغال و تصورات حصول حق کے ذرائع ہیں ان کو اصل نہیں سمجھنا چاہیے۔ مشاہدہ حضور قلب سے حاصل ہوتا ہے۔ اور مشاہدہ سے ہی حق تک رسائی ہوتی ہے جس کے قلب صنوبری میں حق جاگزیں ہو وہی حق کو پا بھی سکتا ہے۔ وصول حق کا ایک طریقہ نفی بھی ہے باطل کی نفی کرنے سے حق مل جاتا ہے۔ اسی وجہ سے چشتی و صابری پہلے اپنے نفس کی نفی کرتے ہیں۔ ہو اور ہو س سے دستبردار ہو کر نفس کو مہذب بنا لیتے ہیں۔ بے لوثی کے ساتھ برابر سعی کرتے ہیں اور اپنے اپنے طور پر معاشرے کی اصلاح میں سرگرم رہتے ہیں۔ اب جو حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سمجھنا چاہے وہ قیاس و حجت سے کام نہ لے۔ وہ توہمات کی نفی کرے اس کے بعد ان کی صورت نظر آجاتے گی صورتے از بے صورتی آید پدید۔ بہر حال حضرت احمد عبدالحق کی پوری تعلیم لفظ حق میں بند ہے۔ اسی تعلیم کو تقویت پر وہ گمراہ درویشوں اور غافل دولت مندوں کی اصلاح فرمایا کرتے تھے اور درویشوں کی اصلاح کے متعلق بعض لوگوں نے اپنی فہم و فراست سے سمجھا کہ وہ درویشوں کی نسبتیں سلب کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ اقتباس الانوار کے صفحہ ۲۱۳ پر یہی معنی بتائے گئے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ دولت مندوں کو راہ راست پر لانے کے ثبوت میں لوٹھی بادشاہوں۔ بابر اور دیگر امرا کے نام ان کے خط پیش کیے جاسکتے ہیں، بعض رؤساء سمجھتے تھے کہ وہ ان سے دنیا ترک کر وادیں گے۔ لہذا ان سے گریز کرتے تھے چشتیہ سلسلہ میں امیروں سے ربط رکھنا بھی ان ہی کی جدت ہے جو

اس زمانہ و ماحول کا تقاضا تھا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ حاجتمند ایک سیر آٹے کی روٹی دو دھ اور گھی میں پکا کر بطور نذر کے لاتے تھے۔ اس کے بعد شیخ العالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دعا سے ان کی مرادیں حق تعالیٰ پوری کر دیتا تھا۔ اس کا نام ”توشہ“ ہے۔ توشے کی روٹی سوائے اپنی اولاد اور مریدوں کے کسی اور کو نہیں دیتے تھے۔ مگر حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی تقسیم عام کر دی تھی۔ اس رسم توشہ کی بناؤں پڑی کہ جب حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے محبوب مرید حضرت بختیار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو سفر سے واپسی میں زیادہ دیر ہو جاتی تو ان کی بیوی اس قسم کی روٹی پیش کر کے ان کی واپسی کے لیے دعا کی التجا کیا کرتی تھیں ایک مرتبہ حضرت بختیار رحمۃ اللہ علیہ کو واپسی میں زیادہ دیر ہوئی تو ان کی بیوی نے دعا کی استعا کی فرمایا ”روٹی لائے عرض کیا کہ آج آٹا نہیں ہے ارشاد ہوا ”تو بختیار بھی نہیں ہے“ چنانچہ اثنار راہ میں حضرت بختیار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ہو گیا اور وہیں کسی جگہ دفن کر دیتے گئے اب وہ ”پیر غیب“ کے نام سے مشہور ہیں اور ان کا روٹ پکا کر منت بھی مانی جاتی ہے لے

حضرت شیخ العالم توشہ ردو لوی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال مبارک شاہ کے عہد میں

۸۳۷ھ میں ہوا۔ ان کے صاحبزادے حضرت شیخ عارف رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۸۶ھ) ان کے خلیفہ و جانشین ہوئے اور شیخ عارف رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ان کے صاحبزادے شیخ محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۸۹۸ھ) قرار پائے ان دونوں بزرگوں نے شیخ العالم کے طرز تعلیم و اصول کی بڑی خوبی سے اشاعت کی یعنی مریدوں کو شریعت پر متحکم کر کے راہ طریقت دکھائی

لے کلیر شریف میں نہر کے پار ایک صاحب مزار ”پیر غیب“ کے نام سے مشہور ہیں مگر یہ بزرگ حضرت بختیار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے پہلے کے ہیں۔

رت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اخلاق کریمانہ کا ہر شخص معترف تھا اور ہر ایک یہی سمجھتا
 کہ وہی ان کا منظور نظر ہے۔ اخلاق کریمانہ ہزاروں کرامتوں کی ایک کھلی کرامت اور اصل میں تصوف
 ہی اخلاق کا ہے۔ بہلول لودھی (متوفی ۱۲۹۲ھ) نے ہر چند چاہا کہ جس طرح داود دہش سے
 سرور دیوں کو رام کر لیا ہے۔ اسی طرح حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بھی اپنا مطیع بنانے
 وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی
 رحمۃ اللہ علیہ نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ ”اگرچہ دست بیعت از شیخ محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کردہ
 لے معتقد و عاشق شیخ احمد عبدالحق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ است“ زبدۃ المقامات میں ان کا تعارف
 طرح کیا گیا ہے کہ شیخ عبدالقدوس قدس سرہ از شیوخ مشہورہ ہندوستان است و از کبار ایشاں
 فرزند ان شیخ صفی الدین است کہ در اصول و فروع علوم از فحول متحققین بود، صاحب تصنیف
 مشہورہ۔ شکر و شورش قوی داشت و وجد و سماع کثیر با وجود کثرت جذبات و توقیر غلبات و اتباع
 منت بنیہ بغایت متعین بود و در التزام امور دینیہ سخت متمکن۔ ان کے متعلق علمائے بدایونی
 لے راتے ہے کہ ”مناقب و کمالات وے از شرح و بیان مستغنی“ سر ڈاکٹر اقبال نے ان کی
 ضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے ایک مقولہ کی داد دی ہے لکھتے ہیں کہ ”صوفیانہ
 ادب کے سارے سرمائے میں شاید ہی کوئی ایسی مثال مل سکے جہاں ایک مختصر سے جملہ
 میں نبوت و ولایت کے نفسیاتی فرق کو اس درجہ صاف و واضح طریقہ پر بیان کیا گیا ہو اور
 وہ مقولہ یہ ہے ”محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم“ درقاب قوسین او أدنای رفقت و باز
 گردید۔ واللہ ما باز نہ گردیم“ مگر ان سب صاحبان کے خلاف لاہور یونیورسٹی

۱۔ اسلام میں مذہبی افکار کی تجدید۔ ڈاکٹر اقبال کے خطبات ص ۱۳۲

۲۔ لطائف قدوسی ص ۶۵ لطیفہ ۹

کے پروفیسر تاریخ جناب محمد اسلم صاحب نے اپنی تازہ تصنیف ”دین الہی اور اس کا منہ“ میں حضرت عبدالقدوس کے عقائد و عدت الوجود وغیرہ کی مخالفت کرتے ہوئے نہ صرف گنگوہی کے ایک مقولہ پر اعتراض کیا ہے بلکہ صابری سلسلہ کے نام پر بھی بٹہ لگایا ہے۔ پروفیسر نے اکبری دین الہی کے پس منظر کی بنیاد ملاً عبدالقادر بدایونی پر رکھی ہے جس کی تاریخی لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں۔ ملاً صاحب کی صدق مقالی تسلیم مگر ان کا نقطہ نظر محدود تھا۔ اس میں اسلامی جامعیت و وسعت نہیں پائی جاتی۔ انہوں نے اپنے ذاتی معیار کو مدنظر رکھا ہے اور اکبر کے نظریہ کو سمجھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مغل ہر زمانہ میں باوجود مسلمان ہو جانے کے اپنے قومی رسم رواج کے پابند رہے ہیں۔ اکبر مغل تھا۔ چنگیز خاں کی طرح بے پڑھا لکھا تھا مگر بہادری ذہانت و فراست میں اس کی مانند تھا۔ دونوں کے فتوحات اور طرز حکومت میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ چنگیز کا نظریہ یہ تھا کہ جس طرح آسمان کا اکیلا حکمران آفتاب ہے اسی طرح زمین کا حاکم بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اکبر مسلمان تھا اور اس کے ابتدائی حالات سے ظاہر ہے کہ پابند مذہب تھا۔ اور مذہب کے سمجھنے کا شوق بھی رکھتا تھا۔ اسی غرض سے اس نے عبادت خانہ کا اجراء بھی کیا تھا۔ مگر علماء اسلام کی تنگ نظریوں اور نفسانیت سے بائوس و بیزار ہو کر فتح گجرات کے بعد مذہب ہی تحقیق کے سلسلہ میں سب سے پہلے پارسیوں، پھر نمبر وار پرتگال کے عیسائیوں جنیوں اور برہمنوں سے تعلقات پیدا کئے اور ہر ایک سے کچھ اصول اخذ کئے جن سے اس کے مغلیں رسم و رواج کی تائید ہوتی تھی۔ ابو الفضل فیضی، بیربل اور ٹوڈر مل اس کے استاد رہنا نہیں تھے۔ علمائے اسلام کو صحیح راہ دکھانے کے اگرچہ مواقع حاصل تھے مگر وہ اپنی انانیت و بے شعوری کی وجہ سے اس کی تکمیل نہیں

۱۔ اکبر کے اس مغلیں نظریہ کو مان لینے کے بعد کیسے کہا جاسکتا ہے کہ بیربل نے اکبر کو آفتاب پرستی کی طرف مائل کیا تھا یا شہ دی تھی۔

رکے پھر اپنی ناکامی و سببِ نجاتی پڑا نہوں نے اپنے دل کے حیلے پھوپھو لے پھوڑتا شروع کر دیئے۔ اس
 حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اکبری دین الہی کا پس منظر وہ نہیں ہو سکتا جس کا نقشہ پروفیسر صاحب
 محمد اسلم صاحب کھینچا ہے۔ بہر حال پروفیسر صاحب نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے جس
 مقولہ کو مہمل قرار دیا ہے وہ یہ ہے: "ایں چہ شور است و این چہ غوغا کشادہ کے مومن۔ کسے
 کافر کے مطیع کے عامی کے در راہ کے بے راہ کے مسلم کے پار سا۔ کسے ملحد کے ترسا ہمہ در
 یک سلک است اسی مقولہ کی بر سبیل تذکرہ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تائید و تشریح کی
 ہے کسی شخص نے ان سے بیان کیا کہ ایک بزرگ کہتے تھے کہ تمام آدمی۔ کیا مشرک کیا کافر
 کیا مومن۔ سب کی خدا تک رسائی ہے۔ اسلام شرط نہیں ہے فرمایا کہ یہ بزرگ باوجود کمال
 کے سیر آسمان میں تھے۔ البتہ مرتبہ حقائق میں یہ درست ہے کہ مرجع تمام خلایق کا اللہ جل شانہ
 ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے مَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ اَخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّكَ
 عَلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ پر کفایت نہیں کی اور اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی قید لگا
 دی مرتبہ حقائق میں تمام آدمی متساوی الاقدام ہیں پروفیسر صاحب مندرجہ بالا آیت۔
 سورۃ یونس کی آیات نمبر ۱۹ و ۲۳ اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۳۴ پر ٹھہریں تو اعتراض
 کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ نہ ہر جاتے مرکب تو اس تاختم: "حق تو یہ ہے کہ اس مقولہ سے حضرت شیخ
 کی علویت ثابت ہو جاتی ہے اور اعتراض مہمل ٹھہرتا ہے۔"

شیخ العالم کے وصال سے ۳۳ سال بعد حضرت عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ

۱۵ مکتوبات قدوسی صفحہ ۵۵

۱۶ سورۃ ہود آیت نمبر ۵۶

۱۷ امداد المشتاق صفحہ ۲۲ نمبر ۲۰

علیہ گنگوہ میں پیدا ہوتے تھے اور اپنے والد شیخ اسمعیل سے ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل تھی۔ جب وہ بارہ برس کے تھے تو حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ^{۸۸۲ھ} ۱۴۶۷/۸ ہوا تھا۔ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے باطنی طور پر شیخ العالم کی روح سے فیض پہلے حاصل اور بعد میں حضرت شیخ محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ظاہری بیعت کی خلافت پانی خود لکھا ہے کہ شیخ کے وصال کے چالیس سال بعد پندرہ برس کی عمر میں ان سے روحانی صورت سے فیض حاصل تھا یعنی ^{۸۸۵ھ} ۱۴۸۰/۱ کی شادی حضرت عارف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی صاحبزادی سے ہوتی تھی۔ پہلولودمی کے عہد میں جب ردولی کے حالات بگڑے تو وہ ^{۸۹۵ھ} ۱۴۸۹/۹ میں شاہ آباد ضلع انبیا چلے گئے وہاں سے ۳۸ سال سلسلہ کی اشاعت کی۔ ابراہیم لودمی کے مختصر دور حکومت میں اور بعد ابتری پیدا ہوئی۔ سلطان اور امراء میں پیدا اختلاف نمایاں ہوئے حضرت شیخ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ شیخ العالم کے طرز و اصول پر شریعت کے لباس میں طریقت کو بہ حسن و خوبی پیش کرنے کے سلسلہ کی توسیع کی اور ہر حال میں پابندی شریعت کی تاکید فرمائی بلا طین وقت کی اصلاح کے لیے انہیں خطوط لکھے۔ اگرچہ وہ عالم و فاضل نہیں تھے مگر صاحب تصنیف تھے۔ ابن عربی کی "فصوص الحکم" پر حاشیہ لکھا۔ وحدت الوجود کی تشریح کی۔ فارسی و ہندی میں اشعار کہے۔ سماع کا یہ شوق تھا اکثر محویت طاری رہتی تھی۔ ایک مرتبہ محویت میں اپنا چہرہ تک اتار پھینکا تھا۔ اتنا میں شکر کا اس قدر غلبہ ہوا کہ دشت و بیاباں میں رہنے لگے مگر مشائخ نے انہیں باز رکھا تا کہ بستی میں رہ کر مخلوق کو فیض پہنچائیں۔ ان کے سماع و محویت پر اعتساب کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے شیخ حسام الدین المشہرہ اوچھر بھیجے گئے تھے۔ جب وہ گنگوہ آئے تو اتنے متاثر

۱۔ عبدالقدوس گنگوہی کی تعلیمات مصنفہ اعجاز الحق قدوسی ص ۱۶۸ و ص ۲۹۱

۲۔ لطائف قدوسی ص ۳۲

ہوتے کہ اپنا کل اسباب لٹا کر ان کے مرید ہو گئے۔ یہ سن کر سکندر لودی بھی ان کا معتقد ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں عجائب پرستی کا زور تھا۔ معقولات کی وجہ سے توحید کی نئی نئی تعبیریں کی جاتی تھیں لہذا شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے وحدت الوجود کی صحیح تعلیم کے ذریعے اصلاح کی اور بجائے ورود و وظائف کی مزاولت کے روحانیت کے اصول سکھائے اس طرح سلسلہ صابری کی مقبولیت دیکھ کر حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور اعتراضوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ شاہ آباد سے منتقل ہو کر حیب انہوں نے گنگوہ میں سکونت اختیار کی۔ یہ تو مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مزار نچینہ بنوایا اور عرس کی ابتداء کی صابری تعلیم کو جب کھلے بندوں شیخ العالم نے جاری کیا تو دیگر سلاسل کی طرح یہاں بھی مجاہدات وغیرہ کی مشق کرائی جانے لگی۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ باطنی توجہ کو موخر کر دیا گیا۔ شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ہزاروں کو مرید کیا اور سیکڑوں کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ ان کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فراوانی جذبات میں ان کی زبان سے ایسے کلمات نکل جاتے تھے جو ناقابل فہم اور قابل اعتراض ہوتے تھے ایسے کلمات کو شطیحات کہا جاتا ہے اور ان کی گرفت نہیں کی جاتی ہے۔ ان کا وصال شیر شاہ کی فتح دہلی سے تین چار سال پہلے ہمایوں کے اولیں عہد میں ہوا۔ سال وصال ۹۴۲ھ / ۱۵۳۴ھ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ مقولہ حضرت عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ من اس سلسلہ را رنگ دیگر دادہ ام صاحب اقتباس الانوار مولانا محمد اکرم نے اسکی تشریح یہ کی ہے کہ انہوں نے جلال و جمال میں اہتدال پیدا کیا تھا لیکن یہ مقولہ نہ شیخ گنگوہی کا ہو سکتا ہے اور نہ وہ الساد عموی کہہ سکتے تھے۔ لہذا جو تشریح کی گئی ہے وہ بھی غلط ہو گئی جلال و جمال میں اہتدال پیدا کرنا اسلام کی خصوصیت ہے اسکو کسی ولی کی جدت نہیں سمجھا جاسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ صابری سلسلہ کی تجدید کا سہل شیخ العالم حضرت احمد عبدالحق

۱۔ تکملہ لطائف و تدوی ص ۱۰۹ / ۱۰۱

۲۔ اس آخری سکونت گنگوہ کی مدت دس سال کے قریب ہے۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے سر ہے اس سے کسی کو بھی انکار و انحراف نہیں ہو سکتا۔ اگر ”زنگ دیکر“ کو پتہ
 عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منسوب کرنا ہی ہے تو اس کا مطلب سوائے اس
 کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے امرار سے تعلقات رکھنے میں مبالغہ کیا اور وحدت الوجود کی
 علانیہ اشاعت کی۔ ان کے امرار سے روابط پر اعتراض کیے گئے تھے چنانچہ محمد غوثی نے گلزار
 ابرار میں اس کی تردید میں پوری قابلیت صرف کر دی ہے۔ مگر صرف اتنا لکھنا کافی ہو سکتا تھا
 کہ روسا سے تعلقات باتباع شیخ العالم کیے گئے تھے۔ چونکہ امرار صاحبان اثر ہوتے ہیں اور
 معاشرے میں انہیں مقام حاصل ہوتا ہے لہذا اصلاح معاشرے کے لیے یہ تعلقات ضروری
 تھے اس وجہ سے وہ سیاست میں حصہ لینے کے لیے مجبور تھے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ شیخ گنگوہی
 رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی ابتدائی زندگی میں سیاست و سلطان سے دور رہتے تھے اسی غرض سے
 سکندر لودھی و بابر کو بذریعہ خطوط ہدایات کی ہیں لیکن زمانہ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ اکثر امرار نے
 ان تعلقات سے فائدہ نہیں اٹھایا ان کی کج فہمیوں کا جو نتیجہ ہونا تھا وہی ہوا بھی۔ یعنی انہیں
 عزت و دولت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

پہلے وحدت الوجود کی تعلیم خواص کو دی جاتی تھی اور وہ بھی صیغہ راز میں عوام
 میں اس کے سمجھنے کی اہلیت نہیں تھی جب شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کو عام
 کر دیا تو مغلطے پیدا ہوئے نفس پرستوں نے اس کے غلط معنی لے کر مجذوبیت اختیار کی
 یہ بد قماش معاذ اللہ کبھی خدا بننے کبھی نبوت کے مدعی ہوئے اور وہ ثواب سمجھ کر علانیہ افعال شنیعہ
 کرنے لگے۔ ان ہی بد عنوانیوں کی وجہ سے وحدت الوجود کی بدنامی ہوئی اور ان ہی لوگوں
 کی غلط روی کے باعث ابوالفضل فیضی نے اکبری الحاد کو تقویت پہنچائی جن نصیبیوں
 نے وحدت الوجود کا روپ بھر کر عیش پرستی کی اور دنیا کمائی وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔

ان کی حرکات ناشائستہ کی وجہ سے نہ وحدت الوجود پر حرف آتا ہے اور نہ شیخ عبدالقدوس کو متہم کیا جاسکتا ہے۔ متہم کرنے والے خود وحدت الوجود سے نا آشنا ہیں۔ تاریخ کا برملا اعلان ہے کہ فیروز شاہ کے زمانہ سے بابر کی آمد تک مذہبی وقار میں ناگفتہ بہ کمی آگئی تھی اور نئے نئے فرقے پیدا ہو گئے تھے اس کے بعد جب ہمایوں نے ایرانیوں کی مدد سے دہلی پر دوبارہ قبضہ کیا تو اس کے حلیف اپنے عقائد کی تبلیغ کر کے اور زیادہ ابتری کا باعث ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے اپنا مسک ترک کر کے طمع دنیا کی خاطر سیاست کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اسی سیلاب میں یہ کراہی مذہب اختیار کر لیا ان جملہ خرابیوں کا سدھار علماء سے زیادہ مشائخ نے کیا ہے۔ اس زمانہ میں یہاں چشتی، سہروردی، قلندری اور قادری سلسلے اپنا کام کر رہے تھے۔ نقشبندی سلسلہ اس وقت تک ہندوستان میں رائج نہیں ہوا تھا۔ یہ چاروں ہی سلسلے وحدت الوجود کے قائل اور مبلغ ہیں۔ وحدت الوجود کے عقیدے کی وجہ سے تنگ نظری و تعصب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ مشائخ نے اسی نظریہ کے ذریعے دوسری قوموں کے مزاج کو پہچانا۔ ان کی سماجی حالت کو پرکھا۔ پھر اسلام کے اصول ان تک پہنچانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں وحدت الوجود کو بڑا دخل ہے۔ جب اس کی اشاعت عام کر دی گئی تو افراط و تفریط کی وجہ سے مغالطے اور اختلاف پیدا ہوئے اور اصل تعلیم مسخ ہو گئی حدیث ہے کہ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مستند تذکروں میں بھی ایسی روایتیں ملتی ہیں جو عقل سلیم اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی شان کے خلاف ہیں۔ یہ روایتیں یقیناً الحاقی ہیں۔ حیرت و افسوس اس بات پر ہے کہ بعض اہل قلم ایسی مہمل روایتوں سے استدلال کر کے ان بزرگوں کے خلاف طبع آزمائی کیا کرتے ہیں۔ مثلاً لطائف قدوسی میں جو ان کے صاحبزادے حضرت رکن الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی معرکتہ الآراء تصنیف ہے مذکور ہے کہ جب پہلی مرتبہ

اپنی مسجد میں انہوں نے وحدت الوجود کا درس دیا تو صاحبزادگان نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس پر ناراض ہو کر انہوں نے فرمایا کہ میں ایسے شہر میں نہیں رہنا چاہتا جہاں وہ وحدت الوجود کے منکر ہوں۔ پھر یہ بھی اعلان کیا کہ میرا دین اور ہے اور ان کا دین اور ہے۔ اس طرح حضرت جلال الدین تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے اس وقت تک ملاقات نہیں کی جب تک انہوں نے وحدت الوجود کے قائل ہونے کا یقین نہیں دلایا۔ یہ عبارت خود بول رہی ہے کہ حضرت کے صاحبزادے رکن الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قلم کی نہیں ہو سکتی۔ خدا کے واسطے کوئی بتائے کہ ایسے کلمے ان کی شخصیت پر موزوں آسکتے ہیں یا نہیں عقل و اخلاق ان روایات کے روادار نہیں ہو سکتے اور نہ کسی شیخ کامل سے اس قسم کے سلوک کی امید کی جاسکتی ہے پھر نہ کسی صاحبزادے یا مرید کی اتنی جرأت ہو سکتی ہے کہ اپنے شیخ سے اس قسم کا انحراف کرے۔ ان روایتوں کو یوں بھی باور نہیں کیا جاسکتا کہ جو شریعت کی پابندی کو اصل نہ سمجھتا ہو وہ نہ ایسی ضد کر سکتا ہے اور نہ ایسے شوقیانہ الفاظ اس کی زبان سے نکل سکتے ہیں۔ علاوہ بریں دو تین روایتیں ان کے متعلق اس قسم کی اور بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً فرمایا کرتے تھے کہ ”پتھر شاہی بر سر طفلان ماست“ لیکن انوار العیون میں خود انہوں نے لکھا ہے کہ یہ مصرع شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زبان پر اس وقت جاری ہوا تھا جب ردولی لوٹی گئی تھی اندریں صورت بغیر تحقیق و علم کے ان دروغ بافیوں کو تسلیم کرنا اور بغیر مفہوم و عواقب کو سمجھے ہوئے ان کو شہرت دینا شرافت و دیانت سے بعید ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تعلیم وحدت الوجود

۱ لے لطائف قدوسی ص ۵۹

۲ لے لطائف قدوسی ص ۴

کو سب سے پہلے عام کیا تھا۔ ان سے پہلے دیگر سلاسل کے بزرگوں نے اس کا درس دیا ہے۔ ان کے
اسما گرامی یہ ہیں: شیخ علی مہاتمی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور شیخ حسن طاہر وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم
اجمعین حضرت یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ذاتی تجربہ سے ثابت کیا ہے کہ "عام طور پر جس
کو وحدت الوجود غیر حق کا عدم محض یا فنا کے کامل سمجھا جاتا ہے وہ درحقیقت وجود حقیقی کے سامنے
دوسرے موجودات کا اس طرح ماند پڑ جانا اور مغلوب ہو جانا ہے جس طرح آفتاب کی روشنی
کے سامنے ستاروں کی روشنی ماند اور ذات کا وجود بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں
بھی تشریح فرمائی ہے کہ "کسی چیز کا نابود و معدوم ہو جانا اور چیز ہے اور نظر نہ آنا اور چیز ہے لہذا یہ
غلط ہے کہ بندہ خدا ہو گیا یا یہ کہ بندہ معدوم ہو گیا۔ جب تم آئینہ دیکھتے ہو تو آئینہ کو نہیں دیکھتے
بلکہ اپنی صورت کو دیکھتے ہو۔ اس کا مطلب یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آئینہ معدوم ہو گیا" اس کے
علاوہ کلمہ طیب و کلمہ شہادت پر ایمان رکھنے والے اور اللہ اکبر کا ورد کرنے والے خواب
میں بھی نہیں کہہ سکتے کہ بندہ خدائی کا مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اہل ظاہر کے نزدیک خدا سلسلہ
کائنات سے الگ جداگانہ ذات ہے مگر صوفیہ سلسلہ کائنات سے خدا کو جدا نہیں سمجھتے
وحدت الوجود کے ابتدائی مبلغ نظامی گنجوی، حکیم ستانی، فرید الدین عطار، ابن رشد کازرونی
اور نابلسی تھے۔ ابن عربی، امام غزالی اور امام رازی نے اسی کی تشریح کی ہے۔

حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے اڑتیس سال بعد اکبر
نے ۹۲۸ھ میں عبادت خانہ کی طرح ڈالی تھی اس میں علماء کی نفسانیت و ناشائستہ حرکات کی وجہ
۱۵۶۵ء سے لادینی کا جملہ فتنوں نے اکبر کے دین الہی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ صوفیہ عام نے اپنے
مفاد کی خاطر شریعت کو طریقت سے علیحدہ کر دیا تھا اور طریقت کے نام سے کفر و شرک کے
شعبے دکھاتے جاتے تھے۔ ان فتنوں اور اکبری الحاد کی مدافعت چشتیوں میں حضرت جلال

تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۵۸۱ھ) شیخ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۹۶۵ھ) اور ان کے صاحبزادے حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اور فادر یوں میں حضرت موسیٰ گیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ و شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کی۔ اکبر کے زمانہ آخر میں حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ماوراءالنہر سے ہندوستان تشریف لائے تھے انہوں نے یہاں سلسلہ نقشبندیہ کی سب سے پہلے اشاعت فرمائی بلکہ سب سے قدیم ہے مگر ہندوستان میں سب سے آخر میں جلوہ فرما ہوا۔ حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پہلے لاہور میں نواب مرتضیٰ خاں فرید بخاری ناظم لاہور (متوفی ۱۰۲۶ھ) کے مہمان ہوئے پھر دہلی میں حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حشمتی خانقاہ میں قیام فرمایا۔ ان کے ابتدائی مریدوں میں نواب فرید بخاری خانان۔ مرزا نظام الدین احمد نخشبی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حجاز سے واپس آ کر ۱۵۹۲/۹۳ھ میں حدیث کا مدرسہ دہلی میں جاری کیا تاکہ الحاد و لادینی کی مداخلت ہو۔ مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے مریدوں نے خوبی و استعداد سے کی۔ اس زمانہ میں عام طور پر شریعت کو طریقت سے علیحدہ سمجھا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس کی تردید کی۔ وحدت الشہود کی اشاعت فرمائی اور اکبر کے دین الہی کی مداخلت اپنے مختصر قیام میں بڑے کمال کے ساتھ کی مگر ان کا وصال اکبر کی حیات میں قیام دہلی کے چھ سات سال بعد ۱۰۱۲ھ میں ہو گیا۔ لہذا وہ خود اپنی تعلیم و تبلیغ کو زیادہ عرصہ جاری نہ رکھ سکے ان کے وصال سے ایک سال پہلے ۱۰۱۱ھ میں ابوالفضل قتل کیا جا چکا تھا۔ حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۰۳۴ھ) اپنے والد کے وصال کے دوسرے سال

۱۰۱۱ھ میں تولد ہوئے تھے۔

۱۰۰۸ھ میں خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں بمقام دہلی حاضر ہوئے تھے۔ بیعت کے بعد
 مقامات سلوک طے کئے اور خواجہ صاحب کے وصال سے کچھ پہلے خلافت پائی۔ گویا مرشد کی
 خدمت و صحبت میں چار پانچ سال گزارے۔ پھر سرہند میں اکبر کی وفات تک مریدوں کی
 تعلیم و تربیت میں مصروف رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کا عہد ان کی مجددیت
 کی طیاری کا زمانہ تھا۔ خواجہ صاحب نے ان کے متعلق عظیم الشان بشارتیں دی تھیں۔ اپنے حلقہ
 توجہ میں ان کو سر حلقہ بنا کر بٹھالا اور مریدوں کو حکم دیا کہ ان کی موجودگی میں کوئی شخص میری طرف
 متوجہ نہ ہو۔ مجدد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ابتدا میں ظاہری و باطنی تعلیم اپنے والد سے
 پائی تھی اور ان سے فوائدِ باطنیہ کثرتاً بقول خود حاصل کئے تھے اور یہ وہی حضرت شیخ العالم
 ردو لوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیم تھی غالباً اسی تعلیم کے اثر کو دیکھ کر خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
 نے حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر زیادہ توجہ فرمائی اور اپنا خلیفہ اعظم بنایا۔ اکبر کے انتقال
 ۱۰۱۴ھ کے بعد جہانگیر کی تخت نشینی پر انہوں نے اپنا اصلاحی کام شروع کیا۔ اکبر کے
 ۱۶۰۵/۱۶۰۶ء دین الہی کے اثرات ختم کر دینے کا سہرا یقیناً ان ہی کے سر ہے۔ اکبری عہد کے صوفیہ
 جو وحدت الوجود کے قائل تھے وہ صرف زبانی جمع خرچ کرتے تھے اور جہلار غلط استعمال
 سے فیح حرکات کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن جو لوگ شیخ اکبر سے واقعی متاثر تھے وہ زہد و
 تقویٰ کے میدان میں پیش پیش تھے لہذا ان بطل صوفیوں اور ان مقدس حضرات میں امتیاز کرنے
 کی ضرورت ہے۔ سب کو ایک نظر سے دیکھنا درست نہیں۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے ان
 بطل صوفیوں کی اصلاح، تعلیم و وحدت الشہود سے کی۔ اور ساتھ ہی نقشبندیوں میں جو بدعات
 اس قلیل عرصہ میں رائج ہو گئی تھیں ان کو بھی دور کیا۔ جیسا کہ مکتوب نمبر ۱۳ سے معلوم ہوتا ہے
 ترویج شریعت پر اپنے والد اور اپنے مرشد کے مطابق زور دیا ہے تاکہ جذبات و کیفیات میں

کوئی حرکت شریعت کے خلاف نہ ہونے پائے۔

وحدت الشہود کی تعلیم علامہ الدین سمنانی کی ایجاد کردہ ہے ابن تمیہ نے اسے پروان چڑھایا۔ اور عبدالوہاب نجدی نے اسے شہ دی وحدت الشہود کے مسئلہ میں مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کُلّی طور پر نجدیوں سے متفق نہیں ہیں ایٹا وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا اختلاف تو وہ محض لطفی و اصطلاحی ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر نقشبندی نسبت کا غلبہ تھا ورنہ وحدت الوجود کے منکر یا مخالف نہیں تھے بلکہ خود اس کے ماہر تھے۔ انہوں نے اپنے والد اور شاہ سکندر کیتھلی قادری سے وحدت الوجود کی تعلیم پائی تھی۔ چنانچہ جب تیسری مرتبہ حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں سے سرہند واپس آئے یعنی خواجہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے بعد تو بہت سے لوگ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے اسی زمانہ میں مولانا جمال تلوی نے جو منکر وحدت الوجود تھے مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے وحدت الوجود کے متعلق استفسار کیا تھا۔ تو شیخ سرگوش مولانا بردہ کلمہ چند فرمودند "یعنی کان میں چپکے سے وحدت الوجود کی تشریح فرمادی۔ مولانا تلوی رونے لگے اور اس درجہ متاثر ہوئے کہ مرید ہو گئے حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا احترام کرتے تھے اور ان کا ذکر انہوں نے "زبدۃ المقامات" میں ادب کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت کے خلیفہ حسن بر کی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے مکتوب میں اصطلاح صوفیہ پر اعتراض کئے تھے۔ وہ حضرت کو ناگوار ہوتے اور جواب میں لکھا کہ "خبردار بے سمجھی سے ایسی باتیں آئندہ نہ کرنا۔ اور غیرتِ خداوندی سے ڈرتے رہنا شاید تم کو نقلی و جعلی صوفیوں نے برانگیختہ کیا ہوگا۔۔۔۔۔ مگر بزرگوں کا خیال رکھنا چاہیے۔۔۔۔۔ مدعیانِ طریقت کی بدعات پر نکتہ چینی کرو تو اس کی گنجائش ہے اور وہ بالکل

ٹھیک ہے۔ لیکن جو چیزیں صوفیہ میں مقرر و ضروری ہیں ان پر کلام کرنا سخت نامناسب بات ہے۔ وحدت الوجود کے منازل اور وحدت الشہود کے مدارج۔ اصطلاحوں کے فرق کے علاوہ کم و بیش ایک ہی ہیں۔ مجددیوں کے یہاں جس آخری منزل کا نام ”قیومیت“ ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر غلام مصطفیٰ صاحب نے (جو اس کے ماہر ہیں) اپنی کتاب ”مجدد الف ثانی“ کے صفحہ ۸۱ و ۸۲ پر قیومیت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”قیومیت“ ولایت کا ایک بلند مرتبہ ہے جب ولی اس مقام پر فائز ہوتا ہے تو اس کے افعال اللہ سے منسوب ہو جاتے ہیں نہ اس کی سماعت رہتی ہے نہ دید۔ نہ اس کی گرفت رہتی ہے نہ حرکت

اس وقت

” وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ رَمَىٰ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ

إِنَّمَا يَبَايِعُونَ اللَّهَ -

کے اسرار واضح ہو جاتے ہیں۔ زبدۃ المقامات میں قیومیت کی وضاحت جو کی گئی ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ

(۱)۔ اس عالم میں پروردگار جل شانہ کا خلیفہ و نائب قیوم ہے۔

(۲)۔ عالم کے تمام افراد کے لیے جو اسماء و صفات کے مظاہر و ظلال ہیں ایک ایسی ہستی و وجود کی ضرورت ہے جو تجلیات ذاتیہ سے بہرہ مند ہوتا کہ اس کا قیام اس سے ہو۔

(۳)۔ ایسی برگزیدہ ہستی کا وجود ہی بات نہیں آتی جاعل فی الارض خلیفۃ کے مطابق ایسا فرد کامل ہونا چلا آیا ہے یہی سنت الہی ہے۔

(۴)۔ جو بھی اس مبارک مقام پر فائز ہوتا ہے وہ قبیلہ عالمیان اور سرور اقطاب و افراد۔

۱۔ منقول از تذکرہ مجدد الف ثانی مصنفہ مولانا منظور احمد نعمانی صاحب صفحہ ۳۴۲

ابدال و اوتاد ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ولایت کے لیے خشیت و تقویٰ کی ضرورت ہے نہ کہ کشف و کرامات کی۔ اب اگر وجودیوں کی انتہائی معراج پر غور کیا جائے تو اس کی تفصیل ہو بہو ہی ہے جو قیومیت کی ہے دونوں کا استدلال اسی آیت پاک پر ہے جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ وجود کے معنی اگر وجد کے لیے جائیں تو دونوں مکتب خیال ایک ہوتے ہیں۔ اور وجودیوں اور شہودیوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ لیکن اگر وجود سے موجود کا مطلب لیا جائے تو دونوں میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ وجودی کہتے ہیں کہ کلمہ رطیب کا مفہوم یہی ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے نہ کوئی معبود ہے نہ مقصود ہے اور نہ موجود ہے اس طرح اللہ جل شانہ کی انفرادیت کے ساتھ عالم کا وجود خود ثابت ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ عالم محض مظہر حق ہی نہیں ہے۔ بلکہ عین حق بھی ہے۔ زمین آسمان کی تخلیق حق سے ہے اور خدا کا مشاہدہ خارجی عالم اور انسانی ذات دونوں میں ہو سکتا ہے۔ گویا نفس و آفاق حق تعالیٰ کی نشانیاں ہیں اس لیے ان سب کا وجود عین حق جل مجدہ کا وجود ہے۔ لیکن ہر شے بذات خود خدا نہیں ہو سکتی۔ نوعیت اصل ہے اور تنوع اس کا مظاہرہ ہے۔ وحدت الوجود کا بنیادی اصول بس یہی ہے۔ وجدان کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ وجود شہود کا صحیح مطلب کثود کے ذریعے ہی سمجھا جاسکتا ہے ورنہ یہ سب سخن آرائی ہے۔ منطق و فلسفہ کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے اور نہ وہ واضح کر سکتے ہیں۔ وحدت الوجود یعنی ہمہ اوست توحید صفاتی ہے اور وحدت الشہود یعنی ہمہ ازوست توحید فعلی ہے۔ حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات اور وجود میں ظل اور اصل کے مدعی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی اصلیت و ظلیت کے قائل ہیں۔ ظل کے معنی خواہ سایہ کے لیے جائیں خواہ لطافت مبارکہ کے سمجھے جائیں ہر دو صورت میں دوئی یا تنوین پائی جاتی ہے۔ لیکن وجودی جس

جو دو عین ذات سمجھتے ہیں اس میں اصل و ظل کی شرط نہیں لگاتے اور وہ صفات کو بھی غیر ذات سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کے لفظی اختلاف و فرق میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "کفر شریعت دو معبود پنداشتیں است و کفر حقیقت دو موجود دانستن است یعنی صورت علمینہ ماتحقق اند۔ و آل ہمہ علم ماست کہ بہ چند رنگ آمدہ پیشہ نیست کہ ایں صورت را عین علم نتوان گفت۔ زیرا کہ ایں تلونات را قبوم و منشاء بود اس طرح انہوں اختلاف تضاد کو ختم کر دیا ہے۔ خداوند کریم حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے درجات میں زیادہ سے زیادہ روز افزوں ترقی فرماتے۔ ان کا وصال ۶۳ سال کی عمر میں ۱۹ صفر ۱۰۳۲ھ کو ہوا۔ وصال سے کچھ پہلے اجیر شریف تشریف لے گئے تھے۔ چاہتے تھے کہ جہانگیر کے لشکر کی اصلاح کو ختم کر کے بقیہ عمر سکون کے ساتھ وطن میں گزاریں۔ اسی غرض کے لیے حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مزار پاک پر مراقبہ کیا تھا۔ مدتے مجازی آل صدر اولیاء مراقبہ نشیند، روحانی ہدایت ہونی کہ "در خلاصی خود ازیں عسکر سعی نہ کنند" یعنی لشکر میں تبلیغ و اصلاح کا کام جاری رکھیں۔ جب باہر آتے تو خدام نے غلاف مزار ان کی نذر کیا۔ انہوں نے اسے لیکر بہ حفاظت تمام اپنے کفن کے لیے رکھ لیا۔ عجب کوائف ہیں۔ مجدد علیہ الرحمۃ کی ابتدائی تعلیم طریقہ چشتیہ میں ہوئی۔ پھر سلوک قادریہ کی تعلیم پائی، اس کے بعد نقش بندیہ میں وہ کمال حاصل کیا کہ مجدد مشہور ہوئے اور آخری حقیقت یہ ہے کہ حضور غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ہدایت و انعام حاصل کیے۔ معلوم ہوا کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں ایک ہیں۔ مخالفت سمول سے نہیں بلکہ ایک ہی سمت سے دونوں مختلف جگہوں پکڑے ہوئے منظر آفتاب سے لطفت اندوز ہو رہے ہیں۔ یہ من و تو کا قضیہ رہنمائی جہالت ہے اور بس۔

قصہ مختصر اس سے انکار ممکن نہیں کہ حضرت عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بعد صابر سلسلہ کی مرکزیت جاتی رہی تھی۔ پھر ڈیڑھ سو سال بعد امر وہہ میں مرکزیت کا اعادہ ہوا اور ۱۶۸ سال قائم رہی۔ آخر میں ۱۳۵۶ھ کے بعد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مرکزیت کو بحال کرنا چاہا مگر ان کے خلفاء اسے نہیں نبھایا سکے۔ خود ان میں تفرقہ پڑ گیا لہذا معاشرے میں ابتذال پیدا ہونا لایمکن تھا جو ہو کر رہا۔ البتہ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خلفاء نے انفرادی طور پر جو خدمت کی تھی وہ مرکز کی کارگزاریوں سے کم اہم نہیں خیال کی جاسکتی۔ انہوں نے ہندوستان سے باہر جا کر یہاں کے جملہ سلاسل سے پہلے اپنے سلسلہ کی اشاعت کی۔ حضرت نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور شیخ محمدی رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلفاء کی یہ خصوصیت و حقیقت بھی قابل ملاحظہ ہے کہ اپنے شیخ کے اتباع میں حالات زمانہ کے مدنظر انہوں نے امراء و سلاطین سے ربط و ضبط کو مناسب نہیں سمجھا لوگوں نے اراضی کا قبضہ طے کرنے کو جلال الدین تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو آگرہ بلایا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ”رسالہ تحقیق اراضی ہند“ تصنیف کیا تھا جس میں ثابت کیا ہے کہ بادشاہ کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے زمین دے۔ پھر وہ اس کا حق ہو جاتی ہے۔ اکبر بادشاہ کو وہ بہت پسند آیا اور ان سے اپنے یہاں رہنے کے لیے بھجداصرار کیا۔ مگر وہ راضی نہیں ہوئے اور تبلیغ سلسلہ کی غرض سے وطن چلے آئے۔ ان کی توجہ بجائے امراء کے عوام کی اصلاح کی طرف رہی اور یہ زمانہ اسی کا مقتضی تھا۔

۱۔ لے مرشد سے اختلاف ایسا تھا کہ جیسا امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے شاگردوں کے درمیان میں تھا اور ویسا نہیں تھا جیسا کہ آگے چل کر حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء کے درمیان ہوا۔

حضرت جلال الدین تھانیسری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ابتداء میں زاہد خشک تھے اور
 ع کے قطع مخالف تھے۔ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ
 ایسی چکیا ہے۔ حضرت نے جواب میں کہا بھیا کہ عبدالقدوس محض رفاص ہی نہیں ہے بلکہ
 ص گر بھی ہے۔ جب حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ تھانیسری نے اور مولانا کے مدرسے
 تشریف لے گئے تو اپنے جواب کو سچ کہ دکھایا۔ مولانا ایک نظر کی تاب نہ لاسکے۔ لوٹ
 ہو گئے اور حال بدل گیا۔ بہر حال بیعت مشرف ہوئے اور خلافت کے مستحق ٹھہرے
 کے دین الہی سے انہیں سابقہ پڑا۔ اکبر کا دربار فلسفہ و حکمت سے معمور تھا۔ اکبر نے یہ
 ن کر غیاث منصور ایرانی کے ایک شاگرد فتح اللہ شیرازی بیجا پور میں ہیں وہاں کے نواب
 دل خاں دکھتی سے ان کو طلب کیا چنانچہ وہ فتح پور سیکری آ گئے۔ وہ مذاہب امامیہ
 تھے اکبر نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ نیرنجات کے بھی ماہر تھے۔ ان کی نئی نئی ایجادیں
 و شعبدے مشہور ہیں اس عہد میں انہوں نے معقولیت و شیعیت کو خوب پروان چڑھایا
 پھر پارسی حکیم کامران نے فلسفہ مشائخ کو رائج کیا۔ اس نے اپنی کتاب دستان المذاہب میں جملہ مذاہب
 با خواب مضحکہ اڑایا ہے۔ اکبر کے دین الہی کے خلاف بنگال و بہار میں بغاوتیں بھی ہوئیں مگر وہ
 حکومت کے تشدد کی وجہ سے دب کر رہ گئیں۔ اکبر کا دین الہی کچھ بھی ہو مگر تھاپے حقیقت اس
 کو ملکی مصلحت ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں کہ اس پر کوئی خاص توجہ کی جائے۔ یہ
 دربار کے چند جاہ طلبوں تک ہی محدود رہا۔ صرف نو یا دس چیلے یا مرید میسر آسکے ان کے
 سوائے بیروں کے باقی سب مسلمان تھے۔ اس نو ایجاد فرضی مذہب کے علاوہ اس زمانہ
 میں خود ہی الحاد کا زور تھا۔ علمائے دربار گندم نما جو فروش تھے ان سے بیزار ہو کر اپنے مغلی
 رسم و رواج اور جلگیہ خاں تقلید میں اکبر نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے انتقال

کے بعد اس کا دین الہی دم توڑ گیا۔ پھر حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس دین کے اثرات بھی زائل کر دیئے۔ ملائے بدایونی چودہ برس اکبری دربار میں رہے۔ اس مذہب کی انہوں نے تائید نہیں کی۔ سزا کے خوف سے تین مرتبہ گھر بیٹھ رہے مگر ہر مرتبہ کسی نہ کسی طرح بلبلیے مگر حیرت ہے کہ ایسے ماحول میں رہنا انہوں نے پسند کیسے کیا۔ راجہ مان سنگھ۔ شہباز خاں کبیر اور قطب الدین محمد نے اس مذہب کو قبول کرنے سے اکبر کے منہ پر صاف انکار کر دیا۔ اپنے اپنے عہدوں پر بحال رہے اور معتوب نہیں کئے گئے۔ مدعا یہ کہ اکبر کو خود اس مذہب پر اصرار نہیں تھا۔ وہ سیاسی طور پر مصلحتاً صلح کل ہونے کے خیال سے اپنے اثرات کو بڑھ کر اپنی حکومت کا استحکام چاہتا تھا۔ اور بس۔

حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سلسلہ شتیہ میں اپنے والد کے مرید تھے پھر قادری خلافت شاہ کمال کیتھلی سے حاصل کی تھی۔ آخر میں سلسلہ نقشبندیہ کے مجدد ہوئے۔ ان کی تعلیم میں ان دونوں سلسلوں کی خوب پائی جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو بانڈاز دگر نظام تعلیم و تربیت کے صفحہ ۲۰۳ پر مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے لکھا ہے کہ اور تو اور سیدنا الامام حضرت مجدد سرہندی قدس سرہ نے حالانکہ جو کچھ لکھا ہے عقلیت کے خلاف ان کا سارا کلام جیسا کہ پڑھنے والوں پر مخفی نہیں سراسر عقلی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر مولانا مرحوم ذرا بھی غور فرمائیں تو سمجھ لیتے کہ مجدد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت شیخ العالم ردو لوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرح طریقت کو شریعت کے لباس میں پیش کرتے تھے۔ لہذا عقلیت کی تردید عقل سے اس لیے کی کہ لوہا لوہے کو کاٹا کرتا ہے۔ اگر طریقت کے اصول پر تردید فرماتے تو عقلیت والے اسے کیا سمجھتے۔ چونکہ صابری اور مجددی طرز تعلیم ایک سا ہے اسی لیے مجددی حضرات مخدوم

سے پتہ نہیں کہ قیاس الدین کو کہتے تھے یا کوئی اور تھے۔ منتخب التواریخ میں یہی نام لکھا گیا ہے۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے سلسلہ کا خاص طور پر احترام بھی کیا کرتے ہیں۔

نظام الدین بلخی تھانیسری (متوفی ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۶ء) حضرت جلال تھانیسری - بھتیجے
 و اور خلیفہ تھے جہاںگیر کو ان سے عقیدت تھی مگر اس شہر پر کہ انہوں نے باغی شہزادہ خسرو کو
 دی تھی بادشاہ نے ان کو جلا وطن کر دیا تھا۔ وہ حرمین شریفین کی زیارت کے بعد بلخ میں
 نیم ہو گئے تھے۔ ان ہی کا دم ہے کہ اس دیار میں صابری سلسلہ کی اشاعت کی ان کا وصال
 میں ہوا۔ وہیں مدفون ہوتے ان کے خلیفہ حضرت محب اللہ الہ آبادی صابری رحمۃ اللہ تعالیٰ
 (متوفی ۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء) نے ہمیشہ امیروں سے بے نیازی برتی۔ شاہجہاں نے ہر چند انہیں بلایا
 انہوں نے معذرت کر لی۔ البتہ اپنے قیام الہ آباد میں شہزادہ داراشکوہ ان سے فیضیاب
 دیا تھا اور سفینۃ الاولیاء میں اس نے اس کا ذکر بھی کیا ہے اورنگ زیب کو حضرت محب اللہ
 رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کچھ پرچاش تھی۔ ان کے خلیفہ شاہ محمدی امرہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی
 ۱۱۹۷ھ) کی جب شہرت ہوئی تو اورنگ زیب نے اپنی خام خیالی کی وجہ سے انہیں مکہ
 شریف چلے جانے کا حکم دیا۔ وہاں انہوں نے صابری سلسلہ کی اشاعت ملک روم تک کی۔
 ۱۰۹۹ھ کے بعد جب وہ واپس آئے تو پانچ سال تک انہیں قلعہ اورنگ آباد میں
 قید رکھا گیا۔ پھر اکبر آباد میں ان کا وصال ہوا۔ ان کے خلیفہ شاہ عضد الدین امرہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ
 علیہ (متوفی ۱۱۷۲ھ / ۱۷۵۹ء) کو ان کی تصنیف "مقاصد العارفین" پر روہیلہ نواب نے انعام و وظیفہ پیش کیا
 مگر انہوں نے قبول نہیں کیا اور متوکل رہے ان کی پیشین گوئی کے مطابق مدت بعد شاہ عالم کے مرہٹوں
 نے ۱۱۸۵ھ میں ضابطہ خاں روہیلہ کو شکست دی تھی۔ شیخ المشائخ حضرت عبدالباری امرہوی
 رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، شاہ عضد الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ تھے۔ ان کا وصال ۱۲۲۶ھ میں
 ہوا۔ شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ حاجی عبدالرحیم قاسمی ولایتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔

ان صابری حضرات کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحبان سرکار و دربار سے بے تعلق رہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال اور انگریزوں کے عروج کی داستان سے تاریخ بھری ہے۔ مگر ان ہنگاموں میں صابری بزرگوں کی کسی نوعیت سے بھی شرکت و شمولیت نہیں پائی۔ البتہ حضرت عبدالباری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے بعد ان کے خلیفہ حاجی عبدالرحیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سیاسی طور پر نہیں بلکہ علماء کے فتویٰ کی بنا پر سید احمد بریلوی کے ساتھ سکھوں کے خلاف جہاد میں شریک ہو گئے تھے۔ اور ان کی شہادت بالاکوٹ میں ہوئی تھی ان بعد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں سے بریلوی ہوئے تھے۔ حاجی عبدالرحیم فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق سید احمد راسخ کے خلفانے نہایت وثوق سے فخریہ اعلان کیا ہے کہ حضرت فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو رحم علیہ تادری سے فیض حاصل نہیں ہوا اور نہ شاہ عبدالباری امر وہومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے خلافت ملی بلا شرکتِ غیرے وہ سید احمد صاحب راتے بریلوی کے خلیفہ تھے۔ گویا وہ نقشبندی تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو حاجی عبدالرحیم اور ان کی شاخ کا تعلق صابری سلسلہ سے کبھی ہو سکتا اور ان کی حق نہیں کہ اپنے آپ کو صابری مشہور کریں، مگر خدا جانے یہ لوگ نقشبندی بننے سے کیوں شرماتے ہیں۔ "شعائر امدادیہ" کے صفحہ ۱۶۳ پر ایک روایت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مشہور شاعر مومن خاں مومن سے نقل کی ہے۔ یہ کہ ایک روز شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

۱۔ حضرت فاطمی کے سید احمدی ہونے کا دعویٰ حسب ذیل کتب میں ہے۔ (۱) مخزن احمدی (۲) سوانح احمدی (۳) ارواح ثلاثہ (۴) سوانح قاسمی (۵) سید احمد شہید مصنف مولانا غلام رسول مہر صاحب۔ وغیرہ

۲۔ یہی روایت "امداد المثلثات" میں بھی ہے۔

نے اکابر دین کا تذکرہ کرتے ہوئے مردانِ کامل کا ذکر کیا تھا۔ ایک شاگرد نے عرض کیا کہ آج کل مردِ کامل نظر نہیں آتے۔ فرمایا کہ ”پر سوں فلاں سمت سے فلاں وقت ایک شخص مسئلہ پوچھتے یہاں آئے گا اسے دیکھ لینا وہ مردِ کامل ہے“ چنانچہ موعودہ وقت پر جو صاحب آئے وہ حضرت حاجی عبدالرحیم فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے۔ مردِ کامل نے اس طرح مردِ کامل کو دکھا دیا اب ملاحظہ ہو کہ شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ۱۲۲۶ھ میں ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق صاحبزادے کی تعلیم و تربیت کے لیے حاجی عبدالرحیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دو برس تک امر وہہ میں رہے۔ لہذا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں وہ یا تو اس دو برس کے دوران میں آئے یا ۱۸۱۱ء کے بعد آئے۔ سید شہید اس زمانہ میں نواب امیر خاں کے لشکر میں بمقام مالوہ تھے۔ وہاں سے دہلی آنے پر انہیں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خلافت ۱۸۱۸ء میں دی تھی۔ سید صاحب کی پہلی ملاقات ان کے تذکروں کے مطابق حضرت فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سہارنپور کی بونبی والی مسجد میں ہوئی تھی جب کہ تبلیغی دورہ کے سلسلہ میں سید صاحب وہاں گئے تھے نتیجہ یہ کہ جب حضرت فاطمی مسئلہ دریافت کرنے شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو وہ مردِ کامل تھے اور سید احمد صاحب اس وقت نواب امیر خاں کے لشکر میں محض معمولی سپاہی تھے اور شاہ صاحب انہیں خلافت بھی نہیں ملی تھی۔ لہذا حضرت فاطمی کا

اے مالوہ کے لشکر میں ہر افسر نواب کہلاتا تھا ورنہ واقعی نواب کوئی نہیں تھا۔ نواب اشرف علی خاں رئیس کمونہ ضلع علی گڑھ نے اپنے تذکرے ”اشرف نامہ“ میں لکھا ہے کہ وہ اسی زمانہ میں نواب امیر خاں کے ہمان مختلف وقفوں میں تین مرتبہ عرصہ تک رہے ہیں اور وہ فقیر دوست بھی تھے۔ مگر انہوں نے سید صاحب کا نہ ذکر کیا ہے اور نہ ان سے ان کی ملاقات ہوئی لہذا یہ سخت حیرت کی بات ہے۔ یعنی اگر سید صاحب وہاں تھے تو گناہم و بے نشان تھے۔

کمال سید احمد صاحب کا عطیہ کبھی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حضرت فاطمی کے متعلق سید صاحب کے خلفاء اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلفاء کا دعویٰ غلط اور مہا غلط ہے۔ حاجی صاحب ایک روایت سے اس دعویٰ کی تردید ہو جاتی ہے اور وہ روایت امداد المثناق کے نمبر ۲۸۳ پر ہے جو انہوں نے زیارت حرمین کے موقع پر ۱۲۶۱ھ میں سُتی تھی وہ یہ ہے کہ شاہ عبدالرحمن اور شیخ محمد جان نے ہندوستان آکر پہلے حضرت رحم علی شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سلسلہ وقت اور بیعت کی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد یہ دونوں امر وہہ پہنچے۔ شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ ”شیخ محمد جان سے کہہ دو کہ تمہارا حصہ شاہ غلام علی دہلوی کے پاس ہے اور شاہ عبدالرحمن کو میرے پاس لاؤ۔“ اس کے بعد شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مطلب پورا ہو گیا۔ یعنی مرید کر کے توجہ فرمادی۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اس مستند روایت کا علم رکھنے کے بعد معلوم نہیں ان لوگوں کو کیا نجیبت و جنون ہے جو فاطمی رحمۃ اللہ علیہ کو سید شہید صاحب کا خلیفہ کہتے ہیں غالباً ایسا شبہ حضرت فاطمی کی شرکت جہاد کی وجہ سے ہوا۔ انہوں نے بیشک سید صاحب سے بیعت جہاد کی مگر بیعت جہاد اور بیعت ارادت میں فرق ہے ممکن ہے کہ سید صاحب نے اپنی اعزازی خلافت بھی مرحمت فرمادی ہو۔ اگرچہ اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ مگر یہ بھی بیعت ارادت کا مرتبہ نہیں رکھتی۔ سلسلہ اصلی سے چلا کرتا ہے۔ پھر یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ سید صاحب نے جہاد محض سکھوں سے کیا تھا یا انگریزوں سے بھی کیا تھا۔ واقعات حالات اور خصوصاً سید صاحب کے بیانات سے ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے جہاد انگریزوں سے کیا تھا۔ اسی طرح حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا جہاد انگریزوں کے خلاف مشکوک ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ بہ اتباع سید احمد صاحب ان کی جماعت علماء حاکم وقت سے جنگ کرنے کو جائز نہیں سمجھتی تھی مگر ہوا

لے ملاحظہ ہوا حقیر کی کتاب ”سید احمد شہید کی صحیح تصویر“

یہ کہ میجر اسپینکی نے تھانہ بھون کے قاضی عبدالرحیم اور ان کے ساتھیوں کو بلا تحقیق بغاوت کے شبہ پر سہارنپور میں پھانسی دے دی تھی۔ لہذا یہ حضرات انگریزوں سے بدلہ لینے پر آمادہ ہو گئے۔ مجلس شوریٰ طلب کی گئی۔ اس میں مقتدر علماء نے جنگ کی مخالفت کی اور مولوی رشید احمد صاحب نے بر ملا کہا کہ یہ جذبہ انتقام ہے اس کو کسی طرح جہاد سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ مگر پھر بھی فتویٰ جہاد جاری کر دیا گیا اور حاجی امداد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو امیر مقرر کیا گیا۔ جب مقابلہ ہوا تو کچھ علماء شہید ہوئے باقی سب پسا ہو کر روپوش ہو گئے۔ اور امیر جہاد حاجی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خفیہ طور پر ۱۸۵۹ء میں مکہ مکرمہ کو ہجرت فرمائی۔ مختصر یہ کہ یہ جہاد بھی مشکوک ہے اسے انتقامی جنگ ہی کہا جاسکتا ہے۔

جناب سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسمعیل دہلوی کی صحبت و تعلیم کی وجہ سے حضرت فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دیوبندی شاخ کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ حاصل ہوئی یعنی ان صاحبان کو بشارت و ہدایت دینے کے لیے عالمِ رویا میں حضور سرور عالم صلوٰ علیہ وآلہ خود قدم رنجہ فرماتے لگے لیکن خوابوں کی حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات توہمات و تخیلات جو تحت شعور میں پوشیدہ ہوتے ہیں کسی مہیج کی وجہ سے خواب میں ابھر آتے ہیں ان کو اصل نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت سرور کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شبیہ بارک خوابوں میں ابلیس لعین اختیار نہیں کر سکتا بگراے دھوکا دینے میں کمال ہے خواب میں اجنبی صورت کو کسی اور سے موسوم کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اب ان حضرات سے جنہیں خوابوں میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ جلیہ مبارک دریافت کیا جائے تو ہر ایک مختلف شمائل بتائے گا۔ اس کی تاویل یہ کی جاتی ہے

لے منقول از "مولانا محمد احسن نانوتوی" مصنفہ جناب محمد ایوب قادری صاحب ایم۔ اے کراچی

کہ شخص کو اس کے ظرف کے مطابق دیدار ہوا کرتا ہے۔ اس کے کھلے معنی ہیں کہ اس قسم کے خوابوں میں اکثر توہمات و تخیلات کا دخل ہوتا ہے اور اصلیت نہیں ہوتی لیکن اگر سچ بھی ہوا تحدیث نعمت کے طور پر ان کا تذکرہ جائز ہو سکتا ہے مگر اس شرف کے جاوید بجا اظہار برکت جاتی رہتی ہے اور سعادت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور ہے بھی یہ کہ غیرت حسن اعدا کی روداد نہیں ہوتی پھر روحانیت و نورانیت تو اس سے بھی زیادہ حساس ہوتی ہیں جن کو حضور رحمة للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی خوابوں میں زیارت ہوتی ہے وہ قبل و قال میں نہیں پڑا کرتے اور نورانیت سے لطف اٹھایا کرتے ہیں۔ احادیث سے ثابت ہے کہ خوابوں کے احکام لائق تعلیم نہیں ہوتے لہٰذا اس میں شک نہیں کہ روایات صادقہ ثبوت کا چالیسواں حصہ ہیں لیکن روایات صادقہ فضل رحمانی پر منحصر ہیں۔ اور ہر کس و ناکس کا مقصوم نہیں۔ روایات صادقہ و کاذب میں امتیاز کرنے کے لیے بتایا گیا ہے کہ خواب دیکھ کر اس کی تین دفعہ نفی کی جائے۔ اگر ہر سہ مرتبہ تین راتوں وہی خواب تکرار کرے تو صادقہ ہے ورنہ کاذب ہے نفسانی تقوش اور انمول شیطانی کو روایات صادقہ سمجھ لینا مخلصین کا شیوہ نہیں ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ رب العالمین نے انہیں تین نعمتیں عطا فرمائیں ایک یہ کہ ان کے مرید نامی گرامی علماء ہوتے۔ دوسری کہ قیام کے لیے بیت اللہ میں جگہ ملی تیسری یہ کہ دہلی کے مدرسہ رحیمیہ کی طرح دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی حضرت کا سال پیدائش ۱۲۳۳ھ ہے اور انکا وصال مکہ معظمہ میں ۱۳۱۷ھ میں ہوا۔

۱۔ فضائل صحابہ و اہل بیت ص ۲۲۱ ماخوذ از مکتوبات شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

۲۔ یہ تحریک حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سید عابد حسین نے ۱۲۹۷ھ میں دارالعلوم کا دیوبند میں اجراء کیا۔ مہتمم مولانا قاسم اور نائب مہتمم مولوی رشید احمد بنکے گئے معاونین میں مولانا مہتاب علی اور حاجی صاحب کے بڑے بھائی ذوالفقار علی اور (بابی نوٹ اگلے صفحہ پر)

اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ نصیر الدین حنفی دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مرید ہوئے اور سلسلہ نقشبندیہ کی خلافت حاصل کی پھر حضرت نور محمد جھنجھاٹوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سلسلہ صابریہ کی خلافت پائی اور اسی خاندان کے ہوئے حج کے لیے ۱۸۴۱ء میں گئے اور ۱۸۴۳ء میں واپس آئے ۱۸۵۶ء میں انگریزوں سے شکست کھانی اس کے بعد ۱۸۵۹ء میں مولوی محمد یعقوب اور عبدالغنی کی معیت میں براہ سندھ خفیہ طور پر ہجرت فرمائی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مرہاجا مرہاج اور منکر المزاج تھے شخص کی خاطر و طبیعت کا لحاظ و پاس رکھتے تھے۔ اگر کوئی ان کی رائے نہیں مانتا تو فرمادیتے کہ تمہاری خوشی مختلف قسم کے عقائد رکھنے والے ان کے مرید تھے ایک غیر مقلد نے مرید ہونے کے بعد آمین بالچہر اور رفع یدین کو ترک کر دیا۔ حاجی صاحب نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی اور فرمایا کہ ہمارے وجہ سے ترک کیا ہے تو نہ کر میں ترک سنت کا باعث کیوں بنوں سنت یہ بھی ہے اور وہ بھی اور اگر اپنی مرضی سے ترک کیا ہے تو خیر تم جانو۔ غرض حاجی صاحب کی وسعت قلبی اور رواداری بے مثل خصوصیت تھی۔ ان کی تواضع کا مزید ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے خلفا کسی پر کفر کا فتویٰ لگاتے تو حضرت تاویل فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے حاجی صاحب کی تکفیر کی تو فرمایا کہ میں عند اللہ اگر مومن ہوں تو مجھ کو کسی کی تکفیر مضر نہیں۔ اور اگر خدا نخواستہ کافر ہوں تو بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنا حصہ جاتا داپنے منجھلے بھائی قدا حسین

بقیہ نوٹ پچھلا صفحہ

دیگر حضرات جو شاہ عبدالقدیر رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں کے تعلیم یافتہ تھے، قابل ذکر ہیں مسجد چھتہ میں مدرسہ جاری کیا گیا۔ جامع مسجد کی بنیاد ۱۸۲۲ء میں رکھی بعد کمیٹی میں اختلاف شروع ہوئے تو سید عابد علی صاحب حج کو تشریف لے گئے انکی عدم موجودگی میں تنازعہ فسادات اور بڑھے۔ حج سے واپس کر سید صفا کمیٹی سے مستعفی ہو گئے۔ بید صفا کی پیدائش ۱۲۵۰ھ میں اور وفات ۱۲۳۱ھ میں ہوئی۔

لے امداد المشاق ص ۳۷۸

کو ہبہ کر دیا تھا۔ جب مرید ہونے کے لیے کثرت سے علماء آنے لگے تو ان کے قیام و طعام میں دقت واقع ہوئی۔ لہذا فدا حسین کی اہلیہ نے مہمان نوازی کی ذمہ داری لی۔ کچھ دن کے بعد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کی بھانجی کھانا پکھا رہی ہیں اتنے میں حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مع صحابہ کے تشریف لائے اور فدا حسین کی بیوی سے فرمایا کہ اس قابل نہیں کہ امداد اللہ کے مہمانوں کے لیے کھانا پکاتے ان کے مہمان علماء ہیں۔ ان کیلئے کھانا ہم خود پکائیں گے۔ تعبیر یہ لی گئی کہ علماء کثرت سے مرید ہوں گے۔

اس خواب کی تعبیر کے بعد جو عالم و فاضل مرید ہوتے ان میں سب سے اول مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مولوی صاحب پہلی مرتبہ کسی مولوی سے مناظرہ میں کامیابی کی دعا کے لیے حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے انہیں سمجھایا کہ مناظرہ کرنا اچھا نہیں ہوتا اس سے دل سیاہ ہوتا ہے۔ اس پہلی حاضری کے بعد مولوی صاحب نے بارہا مرید کر لیے جانے کی درخواست کی مگر مسموع نہیں ہوئی لیکن حافظ ضامن علی صاحب نے سفارش کی تو انہیں مرید کر لیا۔ اس تعویق کی وجہ یہ بتائی گئی کہ شوق و طلب کو بڑھانا اور پختہ کرنا منظور تھا۔ وقت بیعت مولوی صاحب نے یہ شرط پیش کی تھی کہ ”ذکر و شغل اور محنت و مجاہدہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکے گا“ حاجی صاحب نے ہنس کر فرمایا کیا مضائقہ ہے۔ عرصہ کے بعد مولوی اشرف علی نے دریافت کیا کہ شرط قبول کرنے کے بعد تعلیم کی کیا صورت رہی جواب دیا کہ ”بس مرٹا۔ میری چار پائی اپنے برابر بچھوئی گئی۔ رات

۱۰ ارداح ثلثہ و امداد المشتاق ص ۲۳ و ص ۲۴ ۱۱ امداد المشتاق ص ۱۸ و ص ۳۶ و

فیض الاکار ص ۹۹ تا ص ۱۰۳ ۱۲ امداد المشتاق ص ۱۹/۲۲ و تذکرۃ الرشید ص ۵۷

امداد المشتاق ص ۲۰

کو وہ اپنے ورد و وظائف میں ہوتے تھے اور میں سونا چاہتا تھا مگر نیند نہیں آتی تھی۔ لہذا رفتہ رفتہ میں بھی ذکر و فکر کرنے لگا۔ ایک رات کو میں نے از خود ذکر بالجہر کیا تو صبح کو فرمایا تم نے تو ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشاق کیا کرتا ہے۔ غرض اس طرح ہمت افزائیاں کر کے مجھ سے مجاہد کروالیے اور میری شرط کو کالعدم کر دیا۔

امداد المشاق مصنفہ مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے صفحہ ۲۶ کے نوٹ میں لکھا ہے کہ بعض مسائل میں علماء میں اختلاف تھا مگر اس اختلاف سے اصل مقصود میں قدح لازم نہیں آتا۔ پھر یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ”ہم اے حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ علماء تنازع کر کے العلم حجاب الاکبر کے مصداق بن جاتے ہیں“ اشرف علی صاحب کی اس تحریر کے معنی جو کچھ بھی ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ اختلاف بعض خلفاء اور حاجی صاحب کے درمیان میں تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد ہے کہ میرے خلفاء دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جنہیں میں نے از خود خلافت دی ہے۔ دوسرے وہ جن کو تبلیغ دین کے لیے ان کی درخواست پر اجازت دیدی ہے۔ جن خلفاء کو از خود خلافت دی انہوں نے پوری طرح حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اتباع کیا، مثلاً مولوی لطف اللہ علی گڑھی۔ مولوی احمد حسن کانپوری مولوی محمد حسین الہ آبادی اور مولوی عبدالسمیع رام پوری جن خلفاء نے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے اختلاف کیا ان میں مولوی محمد قاسم نانوتوی۔ مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولانا اشرف علی تھانوی کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔

یہ اختلاف اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب اور رکیک و مبتذل

۱۔ امداد المشاق ص ۲

۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔

ہے متعدد مرتبہ علماء دیوبند کی شکایتیں حاجی صاحب سے کی گئیں مگر انہوں نے فرمایا کہ مولوی رشید احمد صاحب کی تحقیقات لہیت پر مبنی ہے اور اس میں نفسانیت کا شائبہ نہیں اس بحث و تکرار میں عمر تلف نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے محبوب حقیقی سے حجاب ہو جاتا ہے لہ پھر یہ فرمایا کہ جو ہمارا معتقد ہے وہ ہم سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ بعد میں رفع فساد کے لیے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دو رسالے "وعدت الوجود" اور فیصلہ ہفت مسئلہ لکھ کر بھیج دیئے جن میں اپنے مشرب طریقت و شریعت کی وضاحت کی۔ رسالہ فیصلہ ہفت مسئلہ بھیجنے کے بعد مولانا محمد حسین الہ آباد سے بذریعہ خط دریافت کیا وہ تحقیق کر کے بتائیں کہ ہمارے لوگوں نے "دیوبند وغیرہ" اس رسالے کو کس نظر سے دیکھا اور اس کو پسند کیا یا نہیں لکھے۔ علمائے دیوبند نے اپنی تحقیقات کی بنا پر ان رسالوں کو نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا بلکہ فیصلہ ہفت مسئلہ کو نذر آتش کر وا دیا۔ ان اختلافات کی حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نذر میں زرقی برابر بھی اہمیت نہیں تھی کیونکہ وہ سب ہی فروعی تھے۔ سمجھانا ان کا کام تھا۔ ماننا یا نہ ماننا ان لوگوں کا کام تھا۔ مبلغ مرشد اور رسول کا فرض حق کو پہنچا دینا ہوتا ہے اور بس وہ مجبور نہیں کر سکتے۔ ہدایت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ ایسا بیکطرفہ اختلاف یا تخیل گویا اپنی ڈنلی پر اپنے راگ کی مثال تھا چنانچہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ البتہ یہ نصیحت فرمائی کہ اختلاف منظر عام پر نہ لایا جائے تاکہ فتنہ و فساد نہ پھیلے مگر علمائے دیوبند ماننے والے کب تھے۔ بایں ہمہ حاجی صاحب

۱۔ امداد المشتاق ص ۱۱۱ و قصص الاکابر ص ۳۷۳ و فیصلہ حقیقت مسئلہ

۲۔ رسالہ وعدت الوجود ص ۲ و شمام امدادیہ ص ۵۷۷ رسالہ ۱۲۹۹ھ میں تصنیف فرمایا تھا

۳۔ فیصلہ ہفت مسئلہ رجب ۱۳۱۲ھ میں بھیجا تھا۔

۴۔ سوانح حیات شاہ محمد حسین الہ آبادی ص ۳۰۳

رحمۃ اللہ علیہ نے ہر ہر موقع پر ان صاحبان کی قدر و منزلت کا برابر اظہار کیا ہے۔ مولوی رشید احمد صاحب کے اس شبہہ کے متعلق کہ شاید حاجی صاحب کب سیدہ خاطر ہو گئے اپنے خط میں اس کی تردید کرتے ہوئے آخر میں لکھا کہ ”فقیر نے مسائل مختلف فیہا کے باب میں آپ کی کوئی تحریر نہیں دیکھی نہ پڑھی اور نہ اس کی تفتیش کی۔ فقیر تو آپ کے سب اقوال کو ہوا فن شرع ہی جانتا ہے۔ مزید برآں اگر بعض مسائل میں موافقت نہ ہو تو فقیر ایسے اختلاف کو صحابہ کا اختلاف سمجھتا ہے اور آپ کے ہر قول کی تاویل و توجیہ میرے دل میں نہایت جمعیت بخش و تسلی دہ ہے۔ حاجی صاحب نے اپنی تواضع اور اپنے اخلاق کریمانہ سے ان کی جو تعریف اور عورت افزائی کی اس میں اصلاح کی کوشش موجود ہے جسے تالیف قلوب بھی کہا جاسکتا ہے بقول شخصے ”عاقلاں را اشارہ کافی است“ افسوس یہ حضرات اپنی مشخنت میں پھولے نہیں سماتے اپنی رائے پر اڑے رہے پاپان کار اپنی تحقیقات کے لئے ڈھول بجاتے کہ اس کی آواز ابھی تک گونج رہی ہے۔ مولوی رشید احمد صاحب نے اعلان کیا کہ ”جس فن کے امام حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں ہم ان کے مقلد ہیں۔ باقی ان فرعیات کے امام ہم ہیں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو چاہیے کہ ہم سے پوچھ پوچھ کر عمل کریں“ اور مولوی قاسم نے فرمایا کہ ”ہماری معلومات زائد ہیں اور حاجی صاحب کا علم زائد ہے“ لہٰذا ان ارشادات کے معنی جو کچھ بھی سمجھے جائیں۔ مگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک طریقت، شریعت سے جدا فن ہے۔ مگر حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا کہنا ہے کہ اقرار باللسان اشارہ طرف شریعت کے ہے اور تصدیق بالجنان

لہ امداد المشتاق ص ۱۹۶ (تاویل کا لفظ غور طلب ہے۔ تاویل اسی بات کی جاتی ہے جو مشکوک

اور صحیح نہ ہو۔)

لہ امداد المشتاق ص ۱۹۶

سے مطلب طریقت ہے۔ اقرار بدون تصدیق کے نفاق ہے اور تصدیق بلا اقرار کے بیکار ہے۔ ان صاحبان نے اس اختلاف کی حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے شاگردوں اور حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اختلاف سے مثال دی اور مولوی اشرف علی صاحب تے تو اس اختلاف کو جائز قرار دینے کے لیے اپنی ساری قابلیت صرف کر دی مگر ساتھ ہی ازراہ انصاف یہ بھی تحریر کیا ہے کہ بقول شخصے "تا نباشد چیز کے مردم نگویند چیز ہا"

اعلیٰ حضرت کو وہ تشدد پسند نہ تھا جس کو امام ربانی نے اصلاح خلق و احیاء سنت کے لیے دانتوں سے مضبوط پکڑ رکھا تھا..... مسئلہ مسلمہ کی بنا پر اعلیٰ حضرت کی طرف سے اہلیت و استعداد نام کا پروانہ ملے پیچھے صاحب نسبت مجاز طریقت بن کر اعلیٰ حضرت کے اس خیال سے امام ربانی کا موافقت نہ فرمانا شریعت میں تو کیا طریقت میں بھی کسی الزام کا باعث نہیں ہو سکتا..... جو کچھ بھی ہو بد نفس معاندین کے لیے اس بحث میں پڑنا سبب ضلال ہو گیا اور جس نے جو چاہا کہا مگر خدا شاہد ہے بات یہ تھی کہ لاریب حضرت امام ربانی قدس سرہ کو قدوة العلماء اور جامع شریعت و الطریقت نائب رسول بن کر اس طریق کا اختیار فرمانا جو بظاہر شیخ کے قول و عمل سے ظاہر ہو رہا تھا۔ زبردست لغزش تھی جو آپ کو اس مرتبہ عالیہ تک پہنچنے کے لیے وہ مضبوط دیوار بن کر روکنے والی تھی۔

بے ادب را اندرین رہ بار نیست

از خدا خواہیم تو نسیت ادب

آپ کی استقامت کا ڈر فرید بال سے زیادہ باریک راستہ میں آفتاب نصف

قصص الاکابر نمبر ۲۲ و ۲۰ و ضیاء القلوب ص ۹۷

۱۷

بہار کی طرح ایسا چمکا کہ عالم نے دیکھ لیا....“

یہ استدلال ذوالوجہین ہے لہٰذا تشدد و بے ادبی کا اقرار بھی ہے اور انکار بھی۔ ان تشبیہوں

سبھی مغالطہ ہے۔ امام صاحب اور ان کے شاگردوں کا اختلاف فقہی اور میں تھا اور ان کا اختلاف عقائد کے متعلق ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مختلف رائے ہونا ایک حقیقت ہے۔ مگر دونوں صحیح ہیں اسی وجہ سے ان کے اختلاف کو رحمت سے تعبیر کیا گیا۔ یہ اختلاف ناظر حقیقت کی لامحدود وسعت اور بے مثل خوبی کا اظہار ہے۔ یہ کہ کس صحابی کے مشاہدہ کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے یہ اپنے اپنے نقطہ نظر پر منحصر ہے۔ مگر یہاں معاملہ دگرگوں ہے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے خلفاء کے نقطہ نظر کی ہمیشہ تاویل کی۔ ظن نیک سے کام لیا ان کو غلط نہیں کیا۔ مگر ان کے خلفاء نے حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نظریہ پر برابر اعتراض کیے۔ اس اختلاف کے جوازیں مولوی اشرف علی صاحب نے کافی ثبوت فراہم کئے ہیں مگر ان میں تضاد ہے ان کے تمام دلائل منطقی ہیں۔ ان میں صلاحیت قلب روح کا شائبہ بھی نہیں۔ درحقیقت حاجی صاحب نے واضح طور پر بتایا کہ ”فقیر وہ ہے جو حنفی المذہب و صوفی المشرب ہو۔ جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا میرے رابطہ و واسطہ سے اسے کچھ حصہ نہ ملے گا۔ اور جو فقیر سے اخلاص رکھتا ہو اس پر لازم ہے کہ صوفی المشرب و حنفی المذہب ہو۔ غیر متقلد حدیث دانی اور اہل حدیث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حاشا و کلا حقا سے بہرہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا وہ اہل حدیث کے زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ایسے لوگ دین کے رہزن ہیں ان کے اختلاط سے احتیاط چاہیے“ لے

لے امداد المشتاق ص ۱۹۳ و ۱۹۴۔ لے ملفوظات مرتبہ محمد احسن صاحب ص ۵۔

اس بحث و استدلال پر توجہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ نزاعی مسائل سمجھ لیا جائے تاکہ ان کے دلائل کی حقیقت واضح ہو سکے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب "ضیاء القلوب" میں ذکر و فکر اور اشغال مجاہدات کے طرز لکھے ہیں تاکہ روحانیت کے مدارج آسانی سے طے کئے جاسکیں۔ مگر یہ حضرات ضیاء القلوب ماؤل سمجھتے ہیں۔ طریقت کا ہر سلسلہ مجاہدات کو لازمی و ضروری قرار دیتا ہے۔ مجاہدات کو واد عامہ سے موسوم کیا ہے۔ اب اگر ان صاحبان کو مجاہدات کے متعلق چون و چرا ہے تو اس وجہ وہی شرط ہو سکتی ہے جو پہلے ہی دن بیعت کے وقت مولوی رشید احمد صاحب نے پیش کی تھی کہ مجھ سے محنت و مجاہدات وغیرہ کچھ نہ ہو سکیں گے یہ صاحبان تصور شیخ کو ناجائز اور بت پرست سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے خود اقرار کیا ہے کہ تین سال تک حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا چہرہ پیش نظر رہا اور میں نے بغیر اس سے پوچھے ہوئے کوئی کام نہیں کیا۔ مولوی اشرف علی صاحب نے قطعی طور پر اعلان کر دیا کہ چشتیوں میں تصور شیخ جائز نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کو کل چشتیوں سے موسوم کر دیا۔ انہیں یہ لکھنا چاہیے تھا کہ تصور شیخ کو میں جائز نہیں سمجھتا اگرچہ چشتی جائز سمجھتے ہیں۔ مسئلہ وحدت الوجود کے یہ بالکل مخالف ہیں اور اس کو کفر و شرک خیال کرتے ہیں۔ چونکہ یہ دیوبندی علماء طریقت کو علم معقول سے سمجھنے کے عادی ہیں اس لیے ایسا اختلاف وجود میں آنا ضروری تھا اور اس پر انہیں ناز ہے شریعت کے جن مسائل میں ان کو اختلاف ہے وہ سات ہیں۔ ان میں سے پانچ عملی اور بقیہ دو علمی ہیں۔ وہ پانچ مسائل یہ ہیں۔ (۱) مولود شریفؒ (۲) عرس (۳) سماع (۴) ندائے غیر اللہ

۱۔ ادوایۃ شریفہ ص ۱۹۱ کے حاجی صاحب کہ معظمہ میں نہ صرف مولود شریف کرتے تھے بلکہ رجبی شریف کی محافل بھی منعقد کرتے تھے ان کی تقلید میں یہاں آکر شاہ محمد حسین الہ آبادی نے رجبی شریف کی مجلس کو رائج کیا تھا۔

(ماخوذ از سوانح حیات شاہ محمد حسین الہ آبادی)

(۵) جماعت ثانیہ ان امور کے متعلق جو راتے انہوں نے قائم کی اس سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہوتا، بہر حال اپنی نظر اور اپنی اپنی راتے ہے لیکن یہ کیسے غضب کی بات ہے کہ ان فرعیات کو اصل اصول سے کہیں زیادہ اہمیت دی گئی اور اس طرح اس فخر و ناز سے ملت اسلامیہ میں تازہ فتنہ و زرقہ بندی کی بنیاد پڑ گئی۔ اب رہے دو علمی مسائل (۱) امکان نظیر (۲) امکان کذب تو یہ محض قیاسی رہی و لا طائل مسائل ہیں جن کا حاصل حصول کچھ نہیں اور جن کو اغوائے شیطانی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بحث کی گئی ہے کہ اللہ جل شانہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا نظیر پیدا کر سکتا ہے یا نہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ سے جھوٹ سرزد ہو سکتا ہے یا نہیں۔ العظمۃ اللہ اب اگر ان حضرات سے ایسے ہی لا طائل سوال کئے جائیں تو کیا جواب دیں گے آیا ایک مقدس و معتبر مولوی گناہ پر قدرت رکھتا ہے یا نہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جو حی و قیوم ہے پنے مارتے اور خود کو فنا کرنے پر قادر ہے یا نہیں۔ بہر حال یہ بحثیں الہیات و بالعد الطبیعیات اور فقہی جزئیات کی ہیں ان بحثوں کا طریقت سے تو دور کا بھی واسطہ نہیں اور شریعت بھی ان کی روادار نہیں ہو سکتی۔ جب ان مسائل کی یہی حقیقت ہے اور ان کی شریعت و طریقت میں کوئی اہمیت نہیں تو ملاحظہ طلب یہ ہے کہ ان حضرات نے مرشد سے اختلاف کر کے دین و دنیا میں کون سے چاند لگائے۔ یہ اختلاف غالباً ضد خود نمائی اور خود ستائی پر مبنی ہے اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح طریقت کا امام حاجی صاحب رحمت اللہ تعالیٰ علیہ کو ہم تسلیم کرتے ہیں اسی طرح حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فریاتیات کا امام ہمیں مان لیں اور ہماری پیروی کریں۔ اس قسم کی ضد خود نمائی اور پندار اہل طریقت قدم اول پر فنا کہ دیتے ہیں۔ نفی نفس طریقت میں ضروری سمجھی گئی ہے تاکہ اس قسم کے شیطانی وہم و وسوسے پیدا نہ ہونے پائیں۔ یہ خلفاء جن فروری عقائد پر نازاں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عملاً

شاہ اسماعیل دہلوی کے مُتبع و مُقلد تھے۔ ان میں نہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عقائد پر جلتے ہیں۔ نہ ان میں حاجی صاحب کی تعلیم و تربیت و اشتغال کی روح ملتی ہے اور نہ جذب و سلوک کے مراتب دکھائی دیتے ہیں۔ یہ حضرات جب شاہ عبدالرحیم فاطمی ولایتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حضرت سید احمد صاحب کا خالص خلیفہ ثابت کرتے ہیں تو کیا وجہ کہ اپنے آپ کو نقشبندی نہیں کہتے اور صابری کیوں بنتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

یہ مرثیہ یہیں ختم نہیں ہوتا آجکل ہر جگہ فیروزہ و اکبری عہد سے زیادہ مذہبی ہے۔ دور دورہ ہے۔ منم کی نمائش ہے۔ ذاتیات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور حقیقت و خودی مصلوب ہو چکی ہیں۔ اصلاح و تدبیر کی طرف توجہ کم ہے ہر شخص اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ و بالا سمجھتا ہے۔ یگانگت و اتحاد عنفاً ہیں۔ عموماً تمامی مساعی جمیلہ جلسہ و جلوس۔ احتجاج و فریاد اور چندے جمع کرنے پر ختم ہو جاتی ہے صابری تعلیم نے ظاہری لباس پہن کر فروغ حاصل کیا تھا۔ لیکن موجودہ نئے فیشن کی پوشاک اسے راس نہیں آئی۔ سماع جو چند شرائط کے ساتھ خلوت میں ہوتا تھا۔ اب آزادی اختیار کر کے مجلسی بن گیا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں و درت الوجود کی جو گت بنی تھی وہی آجکل سماع کا حال ہے۔ یہاں تقریباً پچیس تیس صابری خانقاہیں ہیں وہ لکیر کو پیٹ رہی ہیں اب ان کا مصرف وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔ حالانکہ دعویٰ وہی ہے۔ اس گری ہوئی حالت میں اگر اصل مقصد کے لیے متحدہ کوشش کی جائے تو عرسوں میں کوئی وجہ نہیں کہ اتحاد و تاثیر نہ ہو بہر حال رحمت حق بہانہ می جوید

خُلاصہ

- ① سلسلہ صابری اپنے دوسرے خلیفہ حضرت کبیر الاولیاء تک نقاب پوش رہا۔
- ② جب سہروردیوں اور نظامیوں میں اختلاف ہوا تو تیسرے خلیفہ شیخ العالم حضرت احمد عبدالحق ردو لومی رحمۃ اللہ علیہ نے نقاب الٹ دی اور صابری تعلیم کی علانیہ تبلیغ کی اور یہی حضرت صابری سلسلہ کے مجدد ہیں۔
- ③ شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جدید طرز تعلیم کی بہترین طریقہ سے اشاعت کی اور معقولات کی وجہ سے تصوف کی جو مخالفت کی جاتی تھی اس کا دفعیہ بڑے کمال سے کیا۔
- ④ شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس مقولہ کے کہ ”من این سلسلہ راز تک دیگر دادہ ام“ کے یہ معنی نہیں کہ جلال و جمال میں اعتدال پیدا کیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ امر سے ربط و ضبط میں مبالغہ کیا اور تعلیم وحدت الوجود کو عام کیا۔ مگر ان کے خلفاء نے امر سے تعلقات نہیں بڑھائے اور چشمیوں کی قدیمی روش اختیار کی۔
- ⑤ شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بعد مرکزیت جاتی رہی تھی۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مرکزیت کو جاری کرنا چاہا مگر ان کے خلفاء نے اس کو پھر ختم کر دیا۔
- ⑥ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بعض خلفاء نے بعض مسائل میں اختلاف کیا پھر اس کے متعلق انہوں نے جب حاجی صاحب سے استفسار کیا تو حاجی صاحب نے جواب میں لکھا کہ آپ کے اختلافات کی مجھے خبر نہیں۔ نہ آپ کی تحریریں میری نظر سے

گزریں اور نہ میں نے ان کے متعلق تفتیش کی۔

⑥ جب فیصلہ ہفت مسئلہ لکھ کر بھیجا تو حاجی صاحب نے اپنے خلیفہ محمد حسین الہ آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دریافت کیا تھا کہ خلیفائے دیوبند نے اس کو نظر سے دیکھا۔ آیا پسند کیا یا نہیں۔

⑧ جملہ سلاسل سے پیشتر بیرون ہند سلسلہ کی اشاعت حضرت نظام الدین بلوچ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور شاہ محمد نبی امرہوی نے کی اور سلسلہ صابری کو مقبول بنایا۔

⑨ اپنے قیام الہ آباد میں شہزادہ داراشکوہ حضرت محب اللہ الہ آبادی سے مستفیض ہوا تھا اور اس کا ذکر اس نے سفینۃ الاولیاء میں کیا ہے۔

⑩ شاہ عضد الدین امرہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شاہی عطیات قبول نہیں کئے اور لوہیوں کی معزولی کی پیش گوئی کی۔

⑪ عبدالرحیم فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شاہ عبدالباری امرہوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلیفہ تھے لہذا اختلاف کرنے والے خلیفے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا دعویٰ کہ حضرت فاطمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت سید احمد رائے بریلوی کے خلیفہ تھے۔ صریحاً غلط ہے۔

⑫ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اختلاف کرنے والے خلیفہ کا طرز عمل اسمعیلیہ و نجدیہ سے ملتا جلتا ہے۔ صابری تعلیم و تربیت کی روح ان میں نہیں پائی جاتی۔

پایان یافتہ
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
مکتبہ صابری
کراچی

حضرت جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

۱- حضرت مخدوم علامہ الدین علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سلطان المشائخ زید نظام الدین بلوچی
رحمۃ اللہ علیہ

۲- حضرت شمس الدین پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

۳- حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

۴- حضرت شیخ العالم احمد عبدالحق رودلوی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ نظام سانی رحمۃ اللہ علیہ شیخ بیرویلوی رحمۃ اللہ علیہ

عبد الغفور اعظم گڑھی رحمۃ اللہ علیہ
(سہ بزرگوں سے اگر سلسلہ چلا ہے تو ان کے خلفائے نام
اور پتے مطلوب ہیں۔)

شیخ بختیار رحمۃ اللہ علیہ شیخ جان جوہوری رحمۃ اللہ علیہ

۵- حضرت شیخ محمد عارف رودلوی رحمۃ اللہ علیہ

۶- حضرت شیخ محمد رودلوی رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ مدھار رحمۃ اللہ علیہ ۱

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ لکن الدین

شیخ عبدالاحد (والد جناب مجدد ہند) رحمۃ اللہ علیہ

۸- حضرت جلال الدین تھانیہری رحمۃ اللہ علیہ

۹- حضرت خواجہ نظام الدین بلی رحمۃ اللہ علیہ

۱۰- حضرت شیخ ابوسعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

ابراہیم پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ درگاہی رامپوری
رحمۃ اللہ علیہ

۱۱- حضرت محبت اللہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ

ابراہیم رامپوری رحمۃ اللہ علیہ

شیخ محمد صادق گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲

شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ، شیخ داؤد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

۱۲- شاہ محمدی مڑوہوی رحمۃ اللہ علیہ

سید محمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

غریب اللہ نوری نواز رحمۃ اللہ علیہ،

عبدالجلیل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

سید نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ

۱۳- شاہ محمد مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

شیخ محمد اعظم ربوہی رحمۃ اللہ علیہ

میران بھیک رحمۃ اللہ علیہ

سید غلام سادات علی
رحمۃ اللہ علیہ

۱۴- شاہ عاصد الدین امرہوی
رحمۃ اللہ علیہ

شاہ محمد جمال ربوہی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ عنایت علی رحمۃ اللہ علیہ

۱۵- شاہ عبد الہادی امرہوی

شیخ عبد الکریم ملا فقیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

غلام علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ

۱۶- اپنے بزرگوں سے اگر سلسلہ جلا ہے تو ان کے نام دیتے مطلوب ہیں (

درگاہ و عرس

رڑکی کے ریلوے اسٹیشن سے صابری درگاہ تک تقریباً پانچ میل کا فاصلہ ہے سڑک نہر کے برابر چلتی ہے۔ راستہ خوش گوار اور منظر دل فریب ہے۔ آدھے راستے پر سولانی ندی ہے۔ ندی کا پل پچاس فٹ بلند ہے ندی کا نیچے بہنا اور پل کے اوپر نہر کا چلنا انجینئری کا کمال ہے۔ نہر کے برابر سڑک اپنی بہار دکھاتی ہے۔ پل زیادہ چوڑا نہیں ہے اس لیے راستہ یک سمتی ہے۔ نہر کے سرے کے ادھر ادھر دونوں جانب تیروں کے مہیب بُت نصب ہیں۔ آگے بڑھ کر چار فرلانگ سے بائیں ہاتھ کی طرف روضہ شریف کا گنبد اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ روضہ ۱۰۳۳ھ میں تعمیر ہوا تھا۔

نہر اور سڑک کے بائیں جانب درگاہ کے احاطہ تک خالی میدان ہے یہاں ٹانگے اور لاریاں وغیرہ کھڑی ہوتی ہیں۔ اسی طرف درگاہ کے متصل بریلی و رامپور کے زائچین کی سچتہ قیام گاہیں ہیں۔ نہر ۱۸۴۹ء میں جاری ہوئی تھی ۱۸۸۵ء میں اودھروں میلکھنڈ ریلوے نکلی تھی جس کی وجہ سے آمد و رفت میں آسانی ہوئی۔ اور عرس کی رونق میں اضافہ ہوا۔ درگاہ قریب نہر کا ایک پل ہے۔ اس پل سے ایک سڑک مشرق میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے روضہ کی طرف جاتی ہے اور اسی جانب کلیر کی آبادی ہے۔ یہی سڑک پل سے دوسری طرف مغرب میں حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی درگاہ تک پہنچتی ہے۔ اس درگاہ والی

سڑک کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ میدھی مغرب کو چلی جاتی ہے اور دوسری شاخ جنوبی سمت
درگاہ کے مشرقی دروازہ تک پہنچاتی ہے۔ اس جنوبی سڑک کے مشرق میں صابری اسٹورا
صابری ہوٹل ہے اور اس کے بعد تقارخانہ ہے۔ اس سڑک کے مغربی سمت میں باورچی خانہ
بیرونی دیوار ہے اور ایک چبوترہ ہے۔ چبوترہ پر مست ملنگ اپنا بستر جمانے ہیں اور چرس
وغیرہ میں چور ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اگر بتی۔ پھول اور مٹھانی کی دکانیں ہیں۔

مشرقی دروازہ عالی شان ہے۔ اس کے دونوں طرف حجرے ہیں۔ داخل ہوتے ہی
سامنے روضہ پر نظر پڑتی ہے۔ روضہ کے اندر حضرت کا مزار مبارک ہے یہ روضہ گلزاری کے چبوترے
کی جگہ پر ہے جہاں کلیر تشریف لاکر مخدوم پاک گولڑ کے درخت کے نیچے قیام پذیر ہوئے تھے
روضہ سے پہلے سنگ مرمر کا مختصر ساحوض اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ اس گولڑ کے درخت کی
جگہ ہے جس کی شاخ پکڑ کر حضرت استغراق میں کھڑے رہتے تھے۔ اصل درخت اب نہیں
رہا۔ مگر اس کے دو تین بچے باقی ہیں جن سے اس گولڑ کا نام چل رہا ہے۔ اسی احاطہ میں شمال
کی جانب ایک سایہ دار گولڑ کا درخت ہے۔ لوگ تبرک کے طور پر اس کے پھل پتے اور
چھال لے جایا کرتے ہیں۔ چند درخت پلکھن اور موسری کے بھی ہیں۔ اصل گولڑ کے مرمری
حوض سے روضہ تک سطح زمین کی برابر سجادہ نشین صاحبان کے مزارات ہیں۔

عرس کی ابتداء ربیع الاول شریف کی چاند رات سے ہو جاتی ہے۔ بعد مغرب
پنج درہ کے سامنے زائرین جمع ہوتے ہیں اور صاحب سجادہ کے ہمراہ مشرقی دروازے سے
کلیر میں ان کے مکان پر پہنچتے ہیں۔ وہاں قوالی ہوتی ہے۔ جب زنان خانہ سے دو خوان آتے
ہیں۔ سجادہ صاحب ایک خوان کو اپنے سر پر رکھتے ہیں اور دوسرا ان کے فرزند اکبر کے سر
کی زینت بنتا ہے۔ قوالی کے ساتھ یہ جلوس درگاہ تک جاتا ہے۔ راستہ میں بعض بزرگ

ان خوانوں کو باری باری اپنے سروں پر لے لیتے ہیں۔ روضہ میں داخل ہو کر رسم منہدی ادا کی جاتی ہے اور فاتحہ کے بعد تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔ اصل عرس بارہویں ربیع الاول شریف کو ہوتا ہے۔ گیارہویں اور بارہویں شب میں رشتی کی جاتی ہے اور روضہ بقعہ نور بن جاتا ہے تیرہویں کی صبح کو دس بجے کے قریب قُل ہوتا ہے۔ چودھویں کو غسل ہوتا ہے۔ غسل کا گلاب اور پانی تبرک کے طور پر زائرین لیتے ہیں۔ تیرہویں کو قُل کے بعد اکثر صاحبان حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس میں شرکت کے لیے دہلی روانہ ہو جاتے ہیں اور وہاں چودھویں تاریخ کی صبح کو قُل میں شرکت کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ کلیئر میں اکثر زائرین عرس کی ابتدا سے کئی دن پہلے بھی آجاتے ہیں اور بعد قُل واپس جاتے ہیں۔ کچھ جو م ۲۰ تاریخ تک بھی رہتا ہے۔ جنگل میں منگول ہو جاتا ہے گویا چند دن کے لیے ایک خوشنما اور وسیع شہر زمین سے اُبل پڑتا ہے۔

نہر کے پُل سے شمالی دروازے تک دو روپہ دکانیں سجی بسی ہوتی ہیں۔ اور درگاہ کے چاروں طرف خیموں اور چھولدا ریوں کی آبادی ہو جاتی ہے۔ مسجد اور روضہ کے اندر قرآن خوانی ہوتی رہتی ہے۔ رات کے وقت مجاہدین نعروں اور ضربوں سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں مینو قوال اپنے اپنے جوہر دکھاتے ہیں اور سامعین وجد میں آکر ان کی جھولیاں بھردیتے ہیں۔ قُل یا ختم کے بعد صاحب سجادہ الاٹھی دانے لٹاتے ہیں۔ اس کے بعد رنگ گایا جاتا ہے اب بڑی مشکل سے بھیڑ کو چیرتے ہوئے پنج دروازہ دیوان خانہ میں جاتے ہیں۔ اسی روز بعد نماز ظہر صبح سجادہ امام صاحب کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں۔ جیٹھ کے مہینے میں دو جمعراتیں شاندار طریقے سے منائی جاتی ہیں اور عرس کا سا منظر ہو جاتا ہے۔

روضہ کے اندر مزار شریف حجرے میں ہے۔ حجرے کی دیواریں سنگ مرمر کی ہیں اور فرش میں سنگ موسیٰ اور مرمر کی آمیزش ہے۔ مزار کے چاروں طرف مرمریں کٹھرا

ہے۔ سب سے پہلے حضرت ترک پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مزار بنوایا تھا۔ امام صاحب کی درگاہ سے قلعہ کے ٹوٹے ہوئے دو پتھر لاکر رکھ دیئے تھے اور اوپر سے مٹی چمکھا دی تھی۔ عرصہ کے بعد ایک سنیا سی نے مزار میں شکاف کر دیا تھا تو مجاوروں نے مرمت کر دی تھی۔ ۹۳۷ھ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مزار پختہ بنوایا تھا۔ لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ ۹۳۳ھ میں پختہ مزار جہانگیر بادشاہ نے بنوایا تھا۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں روضہ کی تعمیر از سر نو ۱۰۳۳ھ میں کی گئی تھی۔ بقول صاحب سیرالاقطاب جہانگیر نے بھی اس میں کچھ اضافہ کیا تھا۔ سو برس کے قریب ہوئے تو انگریزی سرکار نے احمد اللہ سب حج کی ہدایت میں کمیٹی کے ذریعہ مزار اور روضہ کی تعمیر کے متعلق تحقیق کروائی تھی۔ مولانا ظہیر العلماء سہسوانی نے اپنی کتاب "حیات صابرہ" میں اس کمیٹی کی رپورٹ کا خلاصہ لکھا تھا۔ یہ کتاب ملک چمن الدین کے لاہوری پریس سے شائع کی گئی تھی۔ مگر اب اس کا پتہ نہیں چلتا۔ مزار کے حجرے کے چاروں طرف برآمدہ ہے اور سنگ مرمر کی جالیوں سے محدود ہے۔ اس کے ہر سمت آہنی کواڑ ہیں۔ عام طور پر آمد و رفت مشرق کے آہنی دروازے سے ہوتی ہے۔ حجرے کے دو دروازے شرق رویہ ہیں جن پر چاندی پتھر منڈھی ہوئی ہے۔ ان میں سے جو دروازہ (معرہ ۳۳) مشرق و جنوب میں ہے اس سے مزار تک رسائی ہوتی ہے۔

اعلاہ درگاہ بہت وسیع ہے۔ اس میں بیس تیس ہزار آدمی سما سکتے ہیں۔ اعلاہ

۱۹۱۸ء میں بھوپال کی بیگم صاحبہ نے روضہ پر سنگ مرمر کا کام کروایا۔ مزار کے چاروں طرف میرٹھ کے نواب سحاق خان صاحب نے مرمر موسیٰ کافر ش لگوایا تھا۔ اندرونی پانڈاز بابو گوری شکر وکیل آگرہ نے سنگ مرمر موسیٰ کا بنوایا۔ غلام گردش کے باہر عالی اور چھار دیواری جنرل عبید خاں بھوپال نے بنوائی۔ درگاہ کافر ش سنگ مرمر سے صاحب سجادہ عبدالرحیم صاحب نے مولوی عبدالرب ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں بنوایا۔ مزار پر گول کاری بمبئی کے سیٹھ ابراہیم عرب نے کروائی۔

ہر سمت میں سہ دریاں ہیں۔ گوشہ شمال و مغرب میں شاندار مسجد ہے۔ یکم صاحبہ بھوپال نے مسجد
 لے اندرونی حصہ کو وسیع بنوایا تھا۔ وضو کے لیے چبوترے پر ٹین کا سائبان ہے۔ سقاوہ مارٹر امراؤ
 بن قادری صابری نے بنوایا تھا۔ جانب شمال ٹیوب ویل ہے اور اس کنوئیں کے باہر کی طرف
 فی ٹینکیاں ہیں۔ مسجد کے قریب سماع خانہ ہے درگاہ کے مغرب میں دیوان عبدالرحیم خاں
 صاحب کا باغ ہے اور اس میں کوٹھی بنی ہے۔ یہ باغ ۱۳۳۳ھ میں لگایا گیا تھا۔ شمالی دروازے
 کے شرقی جانب کی سہ درمی مولانا شاہ عظمت علی صابری دیوبندی نے بنوائی تھی۔ عرس کے ایام
 میں یہاں ننگر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے برابر ہی مشرق میں باورچی خانہ ہے۔ جنوبی دروازے
 سے نکلنے کے بعد ایک لمبا چبوترہ ہے اس میں مختلف مزار ہیں۔ یہاں ایک پنجابی بزرگ مرزا
 صاحب کا مزار ہے۔ یہ فنانی الفرید تھے۔ انہوں نے پاک پٹن شریف سے آکر یہاں سکونت
 اختیار کر لی تھی۔ نام معلوم نہ ہو سکا۔ ان کی ایک ٹانگ کسی قدر چھوٹی تھی۔ اس چبوترے کے سامنے
 ہی ایک سہ درمی ہے۔ احاطہ درگاہ کے اندر جنوبی و مغربی حصہ میں حضرت ضامن علی جلال آبادی
 رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (متوفی ۱۲۹۶ھ) کا مزار ہے۔ یہاں کبوتر کثرت سے رہتے ہیں اور مشہور
 ہے کہ یہ کبوتر حضرت مخدوم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زمانے کے ہیں۔ ضامن علی صاحب
 کی قبر کے مغرب میں دو پختہ مزار ہیں۔ یہ نواب بھمبو خان کی ہمیشہ اور اہلیہ کے ہیں۔ ان
 دونوں قبروں کے اور نواب بھمبو خان کی قبر جالی دار ہے ان نواب صاحب نے ۱۸۱۳ء
 میں سب سے پہلے درگاہ کی چار دیواری مع شرقی۔ جنوبی اور شمالی دروازوں کے بنوائی تھی۔ پھر

۱۔ مرزا صاحب احقر پر خاص کرم فرماتے تھے۔ دو تین مرتبہ میرے یہاں شیخوپور بھی آتے تھے۔

۲۔ نواب کا نام معین الدین خان تھا۔ روہیلہ تھے اور نجیب آباد ضلع بجنور کے رئیس اعظم تھے۔ حضرت

مخدوم پاک کی دعا سے ان کے دو صاحبزادے محمود خان اور جلال الدین خان پیدا ہوئے تھے۔

سہ دریاں حجرے اور سماع خانہ کو بنوایا تھا۔ مشرقی دروازہ کے باہر جو احاطہ ہے وہ بھی ان کا ہی تعمیر کردہ ہے۔ مکاشفہ کے مطابق مسجد کے جنوب میں ایک اور حجرہ بنوایا تھا۔ اس حجرہ میں مشہور بزرگوں نے اعتکاف کیے ہیں۔ اعتکافات کہ نیوالوں میں حضرت حاجی دارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی بھی شامل ہے نہر کے اس پل کے مشرق میں دو فرلانگت چالیس فٹ کی بلندی پر حضرت امام الدین دمشقی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ ہے۔ یہ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں یہاں تبلیغ کیلئے بھیجے گئے تھے اور جنگِ کلیر میں شہادت پائی تھی۔ مزارِ قلعہ کلیر کے برج پر واقع ہے۔ اس درگاہ کی چہار دیواری ڈھائی فٹ اونچی ہے۔ چبوترے

پر مغرب میں جو حجرہ ہے اسی میں ان کا مزار ہے اور گوبر کی لڑکی کی بھی جکانام گوہر تھا۔ قبر اسی حجرہ میں ہے۔ یہ لڑکی برضا عقیدت مسلمان ہو گئی تھی اور امام صاحب نے اسے اپنی دینی بہن بنا لیا تھا۔ ارد گردنگ سُرخ کی بارہ درمی ہے جو بی بی خورشید بیگم تعلقہ دار ساڈھورہ نے ۱۳۲۷ھ میں بنوائی تھی۔ یہاں کا منظر دل فریب اور خوشنما ہے۔ درگاہ کے مشرق میں مختصر سی آبادی ہے اسی کو کلیر کہتے ہیں یہاں ہی وہ مسجد ہونی چاہیے جس کے متعلق افواہ ہے کہ پانسو پانچ سو جمعہ کی نماز پڑھنے آتے تھے اور جس کو مخدوم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شہید کر دیا۔ اسی سمت میں لب نہر خام راستہ پر پیر غیب کا مزار ہے جو مخدوم ہو گیا تھا مگر جب نہر جاری ہوئی تو پانی نے اس جگہ پہنچ کر ٹھوکر کھائی اور آگے بہنے سے انکار کر دیا۔ نہر کے انجنیئر کلٹلے صاحب کو شارت ہوئی کہ مزار بنوادو تو پانی آگے کو بڑھے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس مزار کے جنوب میں ایک فرلانگ پر کلکلی رحمۃ اللہ علیہ

نہر ۱۸۳۹ء میں نکالی گئی تھی۔ جب پانی پہلی مرتبہ چھوڑا گیا تو آگے آگے گھوڑے پر انجنیئر صاحب دونوں طرف روپیہ کی بوچھاڑ کرتے ہوئے دو دوں نئے اور ان کے پیچھے پیچھے پانی چلتا تھا۔ کسی شاعر کے قصیدہ کا ایک مصرع یہ ہے۔

کاٹ لے صاحب نے گنگا کاٹ لی

کا مزار ہے اور اس کے قریب مسجد ہے یہ صاحب بھی جنگ کلیر میں شہید ہوئے تھے۔
دیوان صاحب کے باغ کی جانب نصف فرلانگ پر علیم اللہ ابدال کا مزار ہے
ان ابدال صاحب کے مزار سے آگے بڑھ کر ایک سرحدی بزرگ مقیم ہیں۔ اپنے مرشد کا فوٹو
آنکھوں کے سامنے رکھتے ہیں پہلے یہ درگاہ میں مقیم تھے۔ سجادہ صاحب سے نزاع ہو جانے
پر اس جگہ رہنے لگے ہیں۔ ان کے معتقدین نے کچھ زمین بھی انہیں ہبہ کر دی ہے جس میں انہوں
نے باغ لگا دیا ہے اور کنواں بھی بنوا دیا ہے۔ عرصہ کا یہ ذکر ہے۔ اب پتہ نہیں ان کے کیا احوال
ہیں یا کیا حشر ہوا۔

عرس میں پنجاب کے زائرین بہت آتے تھے لیکن تقسیم ہند کے بعد پاپورٹ
اور ویزا لے کر کم تعداد آتی ہے۔ لیکن عرس کی رونق میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔
الہی آفتاب چشتیاں رخشندہ بادا



صابری سجادہ نشین

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عارف رحمۃ اللہ علیہ کی
 ۱۳۲۳ھ تا ۱۵۲۶ھ ۹۲۲ھ ان کی شادی

صابرادی سے ہوئی۔ ردولی میں ۳۵ سال مجاہدات کئے۔ ۳۵ سال شاہ آباد ضلع انبالہ
 میں گزارے باقی ۳۱ سال گنگوہ میں کئے۔

۱۵۵۲ء کلیر اور گنگوہ دونوں سجادوں پر متمکن رہے یہ
 شیخ عبدالحمید بڑے صابراڈے تھے اور پیدائش ردولی میں ہوئی تھی۔

۱۵۸۲ء کلیر اور گنگوہ کے سجادہ پر رہے۔
 شیخ عبدالصمد

۱۶۱۳ء ان کے زمانہ میں کلیر اور گنگوہ کے سجادے علیحدہ ہو گئے
 شیخ فتح اللہ

۱۶۱۴ء یہ محض کلیر کے صاحب سجادہ تھے اور
 شیخ محمد صادق شیخ ابوسعید گنگوہی کے بھتیجے اور خلیفہ تھے۔ بافیض بزرگ تھے

شاہجہان کے عہد میں ۱۶۲۰ء میں انتقال ہوا۔

۱۶۵۶ء کلیر کے سجادہ نشین تھے۔ صابری مسجد
 شیخ محمد

انہوں نے بنوائی اب اس کے آثار باقی ہیں اور روضہ
 کی بھی مرمت کروائی۔

۷ شیخ احمد عرف شاہ بٹے ۱۷۷۱ء تا ۱۷۸۱ء شاہجہان نے موضع کلیر وقتہ
کیا اور اورنگ زیب نے اس وقت میں بارہ
مواضعات کا اضافہ کیا۔ اس شرط پر کہ مطیع رہیں گے سو بگھہ زمین کا اقرار نامہ مجاوروں
کے نام لکھ دیا تھا۔

۸ شاہ علی رضا کپڑے ۱۷۶۲ء تا ۱۷۵۹ء میں قرار پایا کہ چڑھاوے کے موٹے
اور پیسے مجاوروں کو دیتے جاتیں باقی سب چڑھاوا حصہ
سجادہ کا حصہ ہوگا۔

۹ شیخ احسان علی ۱۸۰۶ء تا
روضہ کے پاس ان کا مزار سنگ مرمر کا ہے۔

۱۰ شاہ علی بخش ۱۸۳۵ء یہ جوالہ پور میں رہتے تھے۔ ان کے زمانہ میں
نواب بھبھو خان نے عمارتیں ۱۲۳۱ھ میں بنوائیں۔

۱۱ شاہ نیاز علی ۱۸۵۵ء سال بھر کے بعد مجدد ہو گئے تو ان کے صاحبزادے
کے بالغ ہونے تک ان کے بھائی محمد حسین نے نیابت کی۔ اور
۱۸۹۱ء میں چڑھاوے کے متعلق مجاوروں سے مقدمہ بازی شروع ہوئی۔

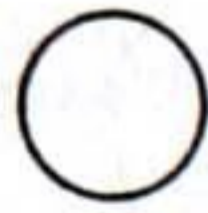
۱۲ شاہ ابوالحسن ۱۸۹۹ء قیام جوالہ پور میں رہتا تھا۔ صرف جمعرات کو درگاہیں
آتے تھے۔ درگاہ پر مجاوروں نے قبضہ کر لیا تھا۔ غدر کے بعد ملک
و کٹوریہ کے زمانہ میں اذقاف کی جانچ پڑتال کی گئی تو انہوں نے بارہ مواضعات
کا فرمان چھاپا لیا اس خیال سے کہ ضبط نہ کر لیا جاتے اور محض کلیر کے وقت کافرمان
پیش کیا۔ چنانچہ وہی بحال رہا۔ موضع منسوب پور پر مجاور قابض ہو گئے تھے اور انہوں

نے اس موضع کو فروخت کر دیا تھا۔ ایک آم کے درخت پر مجاوروں سے مقدمہ ہوا۔
سجادہ صاحب کی ڈگری ہوئی اور اس کا معاوضہ مبلغ چالیس روپے لوادیا گیا۔

تاسلہ ۱۹۰۳ء درگاہ کے متعلق مجاوروں سے جو مقدمہ بازی ہوئی
۱۳ شاہ ظہور الحسن تھی تو حکم مجاوروں کے خلاف ہوا اور سجادہ کو کامیابی ہوئی۔ کامیاب
ہونے پر مجاوروں کو درگاہ میں آنے کی ممانعت کر دی۔ اس دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجاوروں نے
انہیں قتل کر دیا۔

تاسلہ ۱۹۰۶ء سرکار پرست تھے اور گورنر صوبہ لارڈ
۱۴ خان بہادر شاہ عبدالرحیم میٹن کے منظور نظر تھے۔ انہوں نے درگاہ اور
اس کے فرش میں بھی وسعت دی رڑکی سے درگاہ تک پختہ سڑک بنوائی۔ ۱۹۴۶ء
میں خان بہادری کا خطاب دیا گیا۔ آنریری مجسٹریٹ بھی بنے اور ۱۹۴۸ء میں بجلی کی
روشنی بھی کروائی۔

۱۹۶۶ء تک بھلائی و تقید حیات میں
۱۵ شاہ مسعود احمد عرف اکھن میاں ان کی شادی روولی شریف کے صاحب
سجادہ کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔ عربی کے علاوہ انگریزی کی بھی تعلیم ہے۔



صابری خاتقاہیں

۱- خاتقاہ پانی پت :- شاہ عبدالحق پاکستان چلے گئے۔ اب ان کے جانشین شرفاوارہ صاحب ہیں۔

۲- خاتقاہ تھانیر :- جمیل احمد صاحب پاکستان کو ہجرت کر گئے۔

۳- درگاہ شیخ محب اللہ رحمۃ اللہ علیہ محلہ دریا گنج الہ آباد مہتمم مولوی عبداللہ صاحب

۴- خاتقاہ شاہ عبدالمجلیب رحمۃ اللہ علیہ دریا گنج الہ آباد مہتمم محمد میاں صاحب سابق

ایم۔ ایل۔ اے

۵- درگاہ شاہ عضد الدین رحمۃ اللہ علیہ امر وہہ۔ سجادہ نشین حضرت بابو میاں صاحب

۶- درگاہ شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ امر وہہ۔ سجادہ نشین حکیم محمد اسلم الحق صاحب

۷- درگاہ بابا فریدی رجب پور مراد آباد۔

۸- درگاہ ریاست رامپور۔ سجادہ نشین شاہ فضل حسین صابری صاحب

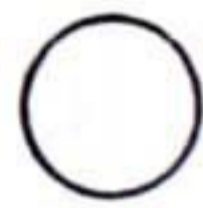
۹- درگاہ قادری باغ۔ ڈبائی ضلع بلند شہر۔ صاحب سجادہ محبوب علی صاحب

۱۰- درگاہ پیر پور ڈاکخانہ کلیر شریف۔ صاحب سجادہ چراغ علی شاہ صاحب

۱۱- درگاہ حافظ لطافت علی۔ دیوبند، صاحب سجادہ۔ حکیم محمد معظم صاحب۔

۱۲- درگاہ حاجی عظمت علی شاہ، محلہ محل دیوبند، شاہ محمد طاہر صاحب

- ۱۳ - درگاہ پیر محمد مجرانہ مظفرنگر، شاہ اظہار احمد صاحب
- ۱۴ - حضرت ابوالمعالی، انبیٹہ سہارنپور، شاہ مودود علی صاحب پاکستان
چلے گئے۔
- ۱۵ - سید ابراہیم رامپور منہار ان سہارنپور، شاہ عزیز حسین صاحب
- ۱۶ - شاہ خاموش، حیدر آباد دکن، شاہ قطب الدین صاحب
- ۱۷ - شاہ محمد حسن صاحب حقیقت گلزار صابری، ریاست رامپور بلن میاں ملک صاحب
- ۱۸ - صابریہ - دریا گنج دہلی، سید نادر حسین صاحب
- ۱۹ - انعام الرحمن قدوس، محلہ شاہ بہلول، عطار الرحمن صاحب
- ۲۰ - شیخ العالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دولی شریف بارہ بنکی شاہ آفاق احمد صاحب
- ۲۱ - گھڑے والے میاں صاحب، گھیرہ ضلع پیلی بھیت شاہ فدا حسین صاحب
- ۲۲ - شاہ سلیمان صاحب، پھلواری شریف پٹنہ، خواجہ حسنین سلیمان صاحب
- ۲۳ - خانقاہ صابری، پیلی بھیت - صوفی انور علی صاحب۔



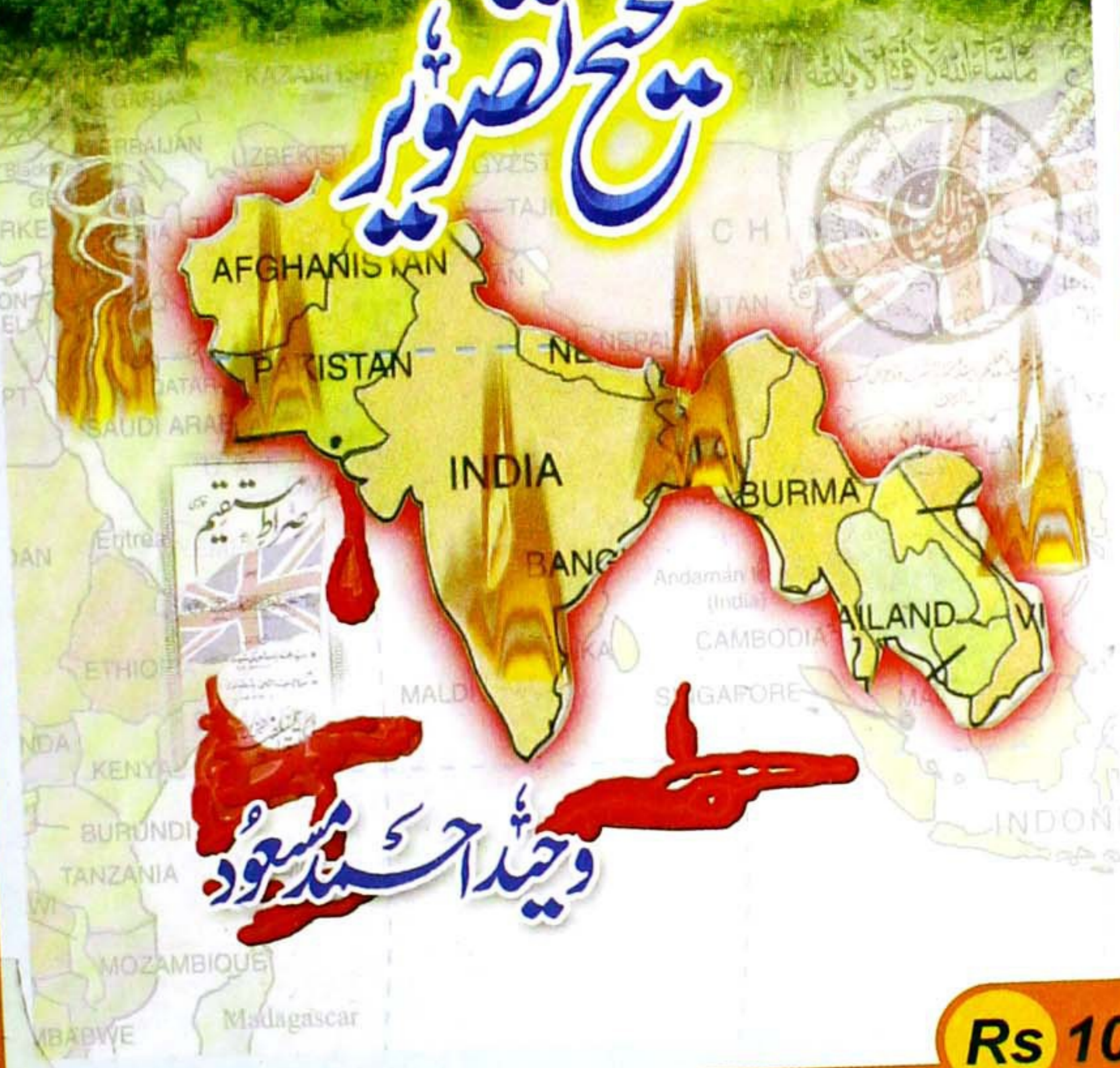
کتابیات

خزینۃ الاصفیاء	فوائد الفواد
انخبار الاخیار	سیر الاولیاء
تاریخ مشائخ چشت جلد پنجم	راحت القلوب
سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات	خیر المجالس
سوانح خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ	سیر العارفین
مکتوبات قدوسی	اقتباس الانوار
نظام تعلیم و تربیت	گلزار ابرار
رسالہ اردو کراچی بابت اکتوبر ۱۹۶۷ء	مرآة الاسرار
انوار العاشقین	جواہر فریدی
انوار العیون	حقیقت گلزار صابری
درمکنون	اسرار عترت فریدی
تاریخ ہند	

کتابچہ احمد شہید

کی

صحیح تصویر



وچند اسکندرمسعود

Rs 100.00

رضایابی کیشن لاهور